نیرنگِ ادب

فہرست مضامین

حصّہ نثر

نمبر شمار	مضمون	نام مصنف یا کتاب	نمبر صفحہ
۱	نصوح کا کلیم کو نصیحت کرنا	توبۃ النصوح	۵
۲	جاڑے کی شدت	فسانۂ عجائب	۸
۳	نصیحت درباب گفتگو	مولوی ذکاء اللہ مرحوم	۹
۴	قلعۂ دہلی	قصص ہند	۱۳
۵	مکھیوں کے سردار کا احوال	اخوان الصفا	۱۵
۶	رنج و راحت	پنجاب ریویو	۱۸
۷	قطب نما	رسالۃ الصنعت	۲۰
۸	سمجھ	سر سید احمد خاں مرحوم	۲۳
۹	آداب طالب علم	مولوی ذکاء اللہ مرحوم	۲۷
۱۰	استقلال	مرقع عالم	۳۰
۱۱	سرسید کے اخلاق و عادات	حیات جاوید	۳۲
۱۲	جشن نوروزی	مولوی محمد حسین آزاد مرحوم	۳۸

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انیسِ ادب

حصۂ اوّل

نثر

۱۔ نصوح کا کلیم کو نصیحت کرنا

کلیم! میں نے تم سے نہیں کہا کہ میرے لئے کمائی کرو، میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اٹھاؤ اور اگر میں ایسا کہتا بھی تو مجھکو اس کا منصب و حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا وہ تمھارے ہی کام آئے گی اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تم ہی کو راحت دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز، کسی سیّاح[1] کا بدرقۂ[2] خیرخواہ سے گریز کرنا روا ہو تو بے شک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم کیا ہمیشہ تمھاری خوشی مجھکو منظور نہ رہی۔

۱؎ سیر کرنے والا ۱۲ ۲؎ راہ بتانے والا ۱۲

مجھ کو ملحوظ نہیں رہی۔ اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا، اپنا عدو ٹھیرایا، تو دشمنی کا سبب، عداوت کا موجب میں نے سنا ہی کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو سو میں تمھاری اس تشخیص[1] کو صحیح اور تجویز کو درست[2] اور اس فراستِ صائب[3] پر جرح[4] نہیں کرتا۔ میں باولا اور سڑی اور پاگل سہی لیکن اگر کوئی باولا تمھاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے تو کیا اس کی بات کو نہ سننا اس کی نصیحت کو نہ ماننا، اُس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا شیوۂ دانشمندی ہے۔ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا اور چاہیئے کہ آیا میں اکیلا اس جنون میں مبتلا ہوں یا اور بندگانِ خدا بھی میری ہی سی رائے، میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں۔ کلیم! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جتنے بزرگانِ دین گزرے ہیں (خدا اُن کی پاکیزہ اور مطہر روحوں پر رحمتِ کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا اُن کی حیات میں برکت دے) کوئی اس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ اُسی قدر برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اس بات کا اقرار کرنا جنون ہی کہ ہم بندے ہیں اور اس کا بھی ہم پر کچھ حق ہی جس نے ہم کو پیدا کیا، جو ہم کو روزی دیتا ہی، جو ہم کو جلاتا مارتا ہی، جو پانی برساتا ہی اور زمین سے ہمارے لئے سرمایۂ حیات اُگاتا ہی، جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آبِ شیریں اور خوش گوار پانی کے سوتے زمین میں جاری کر رکھے ہیں اور ہماری روحوں کے انبساط[5] کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مہیا فرما دیا ہی۔ جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں تاکہ کام کرنے کے لئے دن ہو اور آرام کے لئے رات۔ جس نے دنیا کے قوی ہیکل[6] اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع اور منقاد[7] بنا دیا ہی کہ ان سے ہم سواری لیتے، اُن پر بوجھ لادتے، اُن کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ جس نے انسان کو

---

[1] آنکھ سے ایک بات کو جان لینا [2] ٹھیک درست [3] اعتراض [4] خوشی

[5] مضبوط جُثّے کے [6] فرماں بردار

گویائی اور بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا ما فی الضمیر[1] اپنے ابنائے جنس پہ ظاہر کرسکتا ہے جس نے انسان ضعیف البنیان کو قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اس کی مناسب حالت خلق کیا ہے۔ اگر دنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر دیئے جائیں اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ کام میں لایا جائے اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے ہیں سب کے سب مل کر اس کی تعریف اس کے احسانات، اس کے انعامات روز قیامت تک بیٹھے لکھا کریں تو گھستے گھستے درخت ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں مگر اس کے حق واجب کا عشر عشیر بھی ادا نہ ہو۔ کلیم! فنا ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ دنیا میں کوئی اس کا منکر نہیں ورنہ اس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا کو دفع ہوئے برس نہیں گزرا تمہارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ ہٹے کٹے[2]، توانا، اچھے بچھے، چلتے پھرتے، امیر و غریب، عالم و جاہل، بھلے اور برے سبھی طرح کے صدہا ہزارہا ہدفِ تیرِ قضا ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ وبا پر کیا منحصر ہے وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق! اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا۔ وہی عقیل ہے وہی فہیم ہے وہی زیرک، وہی دانشمند۔ جو اس سوال کا جواب معقول دے۔ جو اس معمے کو حل کرے جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم! انسان کی خاص طرح کی خلقت یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اس سے کوئی بڑی خدمت متعلق اور اس کے ذمہ زیادہ جواب دہی ہے اگر اس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھرے اور سو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اس کے لئے زیادہ عقل کی کیا ضرورت تھی۔ جانور اپنے بڑے بڑے جثوں کی پرداخت[3] پر بخوبی قادر ہیں۔ حال آں کہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں پس اس خدمت اور ذمہ داری کو دریافت کرنا شرطِ انسانیت ہے۔

---

[1] جو کہ دل میں ہے [2] موت کے تیر کا نشانہ [3] پرورش

۲۔ جاڑے کی شدّت

ناگاہ ایک روز گزر مرکب حشمت و جلال با فر و شوکت کمال ایک صحرائے باغ و بہار
دشتِ لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابلِ تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر۔ بو باس
ہر برگ و گل کی رشکِ مشکِ اذفر صفحۂ بیابان معنبر و معطر چشموں کا پانی صفا میں آبِ گہر
آب دار تر، ذائقے میں بہ از شیر و شکر، چلّے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی گویا کہ زمین سے
آسمان تک برف بھر دی تھی، پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں
جمع ہوئے بیٹھے بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے، دھوپ کھانے باہر نہ آتے سے تھے
قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے مونھ سے
دھواں دھار دھواں نکلتا تھا آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی مونھ سے
بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اوس چاٹتے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم
دبا کے بانبی میں بھاگ جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا ہر ایک دست در بغل تھا
اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے گرد پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔
شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے لحاف میں مونھ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا پگھلنے کا کیا حرف
تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی۔ گواہ شرعی شرر تھا لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور
جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں تنورِ
فلکِ چہارم کی چھاتی سرد تھی، گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی لنجوں نے بٹیر پکڑی،
لولوں کے ہاتھ آئے، لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سرزمین ہند میں مردے نہ جلتے تھے
زندوں کے ہاتھ پاؤں گلتے تھے۔ آتشِ رخسارِ گل شبنم نے بجھائی تھی باغ میں جاڑے
کی دوہائی تھی۔ اس برگ و بار کی صنعت پروردگار دکھائی تھی مرصع کاری یک لخت
نظر آئی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتے اور شاخ

الماس اور موتیوں کے آویزے تھے، غدار لالۂ حمرا رشکِ زعفران تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں کہربائی پتے بہار میں رنگ خزاں تھا اس سردی کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ حمام تہ خانے کا خس خانہ تھا۔ آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے، زرد شت کا طریق اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں جاڑے کی یہ ترقی تھی کہ آج تک بتوں کی سرد مہری نہ گئی۔ آفتاب عازم برج حمل تھا۔ آتش پرستوں کا عمل تھا۔ زیست سمندر کی عنوان تھی۔ آگ میں خلقت کی جان تھی۔ دانت سے دانت بجتا تھا، ہونٹ نیلم کو شرماتے تھے، پان کے لاکھے میں سوسن کی پنکھڑی سی نظر آتی تھی۔ جاڑے میں ہر اک المست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اس دشت میں ایسا پالا پڑا تمام اہل لشکر کو تپ و لرزے کا عالم تھا۔ بانکے ترچھے اینٹھے جاتے تھے، ڈھال تلوار کھڑ کھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے۔ تپنچے، چقماق پتھر کلے لاٹھی سے بے کار ہو گئے تھے۔ چاپ کے پتھر آگ نہ دیتے تھے اور توڑے دار کا یہ حال تھا بوجہ کندھا توڑے دیتا تھا۔ قدم اٹھانا محال تھا توڑا ہر ایک گل تھا طوطی کی جگہ شور بلبل تھا۔ ہوش لوگوں کے کانپتے تھے، کیچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ بھونکتے پھونکتے ہانپتے تھے۔ ملایم لوگوں کے حواس جم گئے تھے، جگنو کو چنگاری کے دھوکے اٹھانے کو تھم گئے تھے۔ سردی بس کہ کارفرما تھی یہاں تک جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کہ کرۂ نار زمہریر ہوا تھا۔

۳۔ نصیحت درباب گفتگو

اے بچّو! میں تم کو گفتگو کے باب میں چند نصیحتیں اس لئے کرتا ہوں کہ آدمی جو باتیں کرتا ہے اُن کے بُرے بھلے معنی لگائے جاتے ہیں اور اُس کے موافق اُن کا بہت کچھ بُرا بھلا ہو جاتا ہے۔ جس بات کو تم جانتے ہو یا یقین کرتے ہو کہ جھوٹ ہے اُس کو کبھی

ایسے پیرایہ میں نہ بیان کرو کہ وہ سچ معلوم ہو۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک جھوٹ بولنے کے برابر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ میاں نے زبان سچ بولنے کے لئے دی ہے جھوٹ بولنے کے لئے نہیں۔ قطع نظر اس گناہ کے یوں بھی جھوٹ بولنا انسان کے حق میں مضر ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے دروغ بولے تو کیسے اُن کی سوسائٹی میں سلامتی اور خیریت رہ سکتی ہے۔ کذب سے دل ایسا پاجی اور کمینہ ہو جاتا ہے کہ بے ضرورت جھوٹ بولتا ہے اور سچ بولنا مشکل ہو جاتا ہے اور سچ بولے تو کوئی اعتبار نہیں کرتا اس عادت کے سبب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

تم کو جھوٹ بولنے سے پرہیز ہی نہیں چاہیئے بلکہ اُس کے سایہ سے گریز۔ اگر کوئی بات تمھاری رائے یا قیاس کے موافق ہو یا تم کو اس کی اطلاع ہوئی ہو تو اُس کو یوں نہ بیان کرو کہ قطعی اور یقینی اسی طرح ہے۔ ہمیشہ مختصر الفاظ میں باتیں کیا کرو۔ خصوصاً اجنبی اور بزرگوں کے سامنے کیوں کہ یہ موقع ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تم بزرگوں یا اجنبی آدمیوں کی باتیں سُن کر اپنا علم اور تجربہ بڑھاؤ اور عقل مندی حاصل کرو۔ نہ یہ کہ بکواس کرو جس سے تمھارا ضعف عقل ظاہر ہو اور علم و ادب سیکھنے کا موقع ہاتھ سے جائے۔ ایسے مواقع پر بولنا گستاخی سمجھی جاتی ہے اور خاموشی بہتر ہوتی ہے۔

گفتگو میں طمطراق نہ ہو۔ مخالفوں کو استدلال اور براہین سے ساکت کرو نہ یہ کہ اپنے شور و غل مچانے سے۔

جب کوئی دوسرا شخص بول رہا ہو تو اُس کی بات نہ کاٹو۔ پہلے اُس کی پوری بات سن لو گے اور سمجھ لو گے تو پھر اُس کو جواب خاطر خواہ دے سکو گے جب کوئی بڑا ضروری کام درپیش ہو اُس میں بولنے سے پہلے سوچ لینا چاہیئے

اور جو کچھ بولو۔ پہلے اُس کے معانی خوب سمجھ لو۔ کوئی طعن وطنز اس میں ایسی نہ ہو کہ ڈ
کسی کو ناگوار خاطر ہو اور باعثِ رنجیدگی ہو۔ جو کچھ کہو ادب و حیا کے ساتھ۔ عاقل
بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور احمق بولنے کے بعد۔

کوئی شخص زراعت خوب جانتا ہے اور کوئی تجارت، کوئی علوم ریاضیہ۔ غرض
جو شخص جس فن کا ہو اس سے تم باتیں اسی فن کے متعلق کرو اس سے تمھاری معلومات
بڑھے گی اس طرح کی معلومات بہت کام آتی ہے۔

جب تم اوچھے، اوباش، بیہودہ، شوخ آدمیوں کی صحبت میں بیٹھو تو زبان کو
لگام دو اور بہت احتیاط سے بولو اور اپنا برتاؤ اُن کے ساتھ ایسا رکھو کہ کوئی بُرائی
اُن کی تم کو پتہ لگ جائے

اگر کسی شخص کو تم جانو کہ وہ سچا، سنجیدہ، متین آدمی ہے اور تمھارے سامنے
عجیب و غریب باتیں بیان کرے تو تم اُن کو یقین نہ کرو اور نہ اور لوگوں کو اُن کو
سناؤ۔ نگر یہ بھی نہیں کہ تم اُن کے ساتھ بحث وتکرار شروع کرو کہ یہ باتیں نہیں ہوسکتیں
مگر ہاں تم کو اپنی اظہار رائے کی اجازت ملے تو اُس کو نہایت ادب و لحاظ سے
ظاہر کرو۔ غرض ایسی باتیں کرو کہ نہ دوسرے کو رنج ہو نہ تمھاری احمقانہ سریع الاعتقادی
ظاہر ہو۔ کبھی کوئی لفظ اپنی تعریف کا زبان پر نہ لاؤ۔ اگر اپنی تعریف آپ کرو۔ تو
اس سے معلوم ہوگا کہ تمھاری شہرت بہت تھوڑی ہے اور ایسی تعریف اپنے مونھ سے
میاں مٹھو لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے اور رنجیدہ خاطر کرتی ہے اور تم کو ڈبوتی ہے

تم کسی کی غیبت نہ کرو جب تک وہ اس کا مستحق نہ ہو اور اُس کی ضرورت نہ ہو۔
باتیں کرنے میں نہ قسم کھاؤ، نہ مثل اس کے اور ایسے الفاظ کہو کہ ہم سچ کہتے ہیں
یا ہماری عادت جھوٹ بولنے کی نہیں اگر جھوٹ بولیں تو مرتے وقت ایمان
نصیب نہ ہو اور علیٰ ہذا القیاس۔

جن آدمیوں میں قدرتی عیب و نقص دیکھو تو ہنسی کی باتوں میں اُن کی خاک نہ اُڑاؤ بلکہ اُن سے دل میں متاثر ہو کر نیکی پیدا کرو کبھی ایسی گفتگو نہ کرو کہ جن کے الفاظ لوگوں کا کلیجہ چھیدیں اور چھاتیوں میں برچھیاں لگائیں اور اوروں کی تذلیل و تحقیر و تخویف کا باعث ہوں۔ اچھے الفاظ دوست بناتے ہیں، بُرے الفاظ دشمن۔ آدمی کو چاہئیے کہ جتنے دوست دیانت کے ساتھ پیدا ہو سکیں پیدا کرے۔ پھر جب دوست ایسے ارزاں چند الفاظ شیریں میں ہاتھ لگیں تو اُن کو کیوں چھوڑے۔ اس سے زیادہ کوئی حماقت نہیں کہ تم کسی شخص کو اپنا دشمن بناؤ جس سے اپنے تئیں کچھ فائدہ بھی نہ ہو۔ جب چھوٹوں سے خطائیں سرزد ہوں تو بزرگوں کو اُن کی اصلاح ضرور ہی مگر یہ اصلاح بغیر تلخ کلامی اور درشت زبانی کے ہو تو بہتر ہی۔ درشت زبانی خطاوار کو ڈھیٹ کر دیتی ہی اور ملامت کرنے پر ملامت کرتی ہی۔ اگر کسی شخص کو غصہ بہت آتا ہو وہ تم سے بُری طرح بولے تو تم اُس پر رحم کر کے معاف کر دو غصے نہ ہو۔ تم خوب جان لو کہ خاموشی اور شیریں کلامی انتقام کے لئے لعنت ملامت سے بہتر ہی وہ فوراً دوسرے کے غصے کو فرد کر دیتی ہیں اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہونے لگتا ہی اور یوں سخت سزا اس کو اپنی خطا کی مل جاتی ہی۔ کبھی قسم نہ کھاؤ ہنسی کو کوسو نہیں۔ قسم کھانا، کوسنا پاجی کمینوں کی عادت ہوتی ہی بعض بُرائیاں بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں سے سیکھتے ہیں۔ پس یہ قسم کھانا شریف رذیلوں سے سیکھے ہیں یہ دونوں بُرائیاں ایک سی پاجی پنے کی ہیں خدا کی قسم کھانا اور یہ کسی کو کہنا کہ خدا تجھ کو جہنم میں ڈالے ایک ہی بات ہی۔ ایسا کہنا خدا پرستی ہی کہ آدمی جن اپنے اعضاء اور جان کی سلامتی چاہتا ہی ان سے محرومی کے لئے نہ دوستوں اور عزیزوں کو کوستا ہی جو اوروں پر لعنت کرتا ہی اُس پر خود لعنت ہوتی ہی جو خود فوارۂ لعنت بنتا ہی اُس پر لعنت خود پڑتی ہی۔

۴۔ قلعۂ دہلی

جب جاہ و حشم کے ہجوم کے لیے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو شاہِ جہاں نے دلّی میں ایک نیا قلعہ بنوانا شروع کیا کہ قلعۂ آگرہ سے دو چند اور لاہور سے چند در چند زیادہ ہو۔ چنانچہ کرور روپئے کی لاگت سے دس برس میں بن کر تیار ہوا میرِ عمارت نے عرضی لکھی۔ خود بدولت ہُوا دار آبی پر سوار ہو کر لبِ دریا کے دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ قلعہ کو ملاحظہ کیا۔ سر سے پاؤں تک سنگِ سرخ سے گل رنگ اس پر سنگِ مرمر کے حاشئے کا نرالا ڈھنگ، برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوش نما عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دل کش کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کل قلعہ کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر بہشت پھلو پھول نظر آتا ہے۔ غرض کہ جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوانِ عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام دل بادل تھا اور دیوانِ خاص کے میدان میں سہامنڈل خیمہ ایستادہ ہوا جس کا کلس خیمۂ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصہ میں تیار ہوئے تھے اور ہزاروں گز پشمینے، کشمیرے اور مخمل زربافِ گجرات کے اس پر خرچ ہوئے تھے۔ دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے ایستادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوش نما شامیانے، اطلسی و زربافی، سنہری اور روپہلی چوبوں پر تانے گئے۔ ایوانِ عالی جس طرح طلائی چھت کی مینا کاری سے گوناگوں تھا ویسے ہی ایرانی قالین اور بنارسی کمخوابوں سے بوقلموں تھا۔ صدر سے لے پا انداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل، زرباف، بادلہ و کمخواب، پردہ ہائے فرنگی، دیبائے رومی، اطلسِ چینی سے نگار خانۂ چین کر دیا۔ صدر میں تختِ طاؤس سجایا گیا۔ یہ نمونۂ عجائباتِ دنیا کا تھا۔ کرور روپئے کہنے کو تو

دو لفظ اور ایک بات ہی۔ مگر خیال کرنا چاہیئے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لئے
کس قدر دریا اور پہاڑ آ لٹنے پڑتے ہیں۔ پشت کا تختہ جس پر بادشاہ تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا
دس لاکھ روپیہ کا تھا۔ بارہ مرصّع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت
دھری تھی۔ چھت سے پاتک خالص کندن اور آبدار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔
اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے
اس کی روکار محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا جسے سبزہ و الماس سے سرسبز
اور لعل و یاقوت سے گل رنگ کیا تھا۔ اِدھر اُدھر اس کے دو مور زنگارنگ کے جواہرات
سے مرصّع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگے ہیں
چاروں طرف چاندوں چتر زرنگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی ہے۔ آگے ایک شامیانہ
کہ جواہرات اور موتیوں کی آب داری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ
روپئے کی لاگت میں تیار ہوا تھا۔ سونے روپئے کی چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اس کے
کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبہ سے سجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاسِ ادب
کے لئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جس کی
میناکار جالیاں مرغِ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ ہوا مگر اقبال کا رعب
داب دیکھ کر قدرتِ خدا یاد آتی تھی چنانچہ کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شاہزادے
والا تبار۔ بعد اُن کے راجہ مہاراجہ ملک ملک کے حاکم امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے
لئے کھڑے مگر تمام فرماں برداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل اپنے فرمانروا کے
حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر
بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے بُت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور
عہدہ دار منصب دار حکم کے منتظر تھے اس کے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے
کالے پہاڑ آنکھیں لال لال زربفت کی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں اُچکے سجے

گرزہائے گراں کندھوں پر بادلوں کی بیرقیں ہاتھوں میں۔ تیسرے درجہ میں اہل کار اور ہرکارخانے کے کاردار، منشی متصدی قلمدان بغل میں لیستے آگے رکھے موجود تھے اور دروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کئے قدآدم چاندی کے کٹھرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹھرا کھڑا کیا تھا اور برابر بہادر سپاہی خاص بادشاہی جن میں دائیں پر ترک بائیں پر افغان سامنے راجپوت اپنی اپنی وردیاں پہنے، سنہری، روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لئے جمے تھے۔ یہاں سے دروازہ تک سواروں کے پرے دورستہ بالبتہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے۔ پہرے پہرے پر اپنے نام ونشان بتاتے اور آگے چلے جاتے تھے۔ گو ادب اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش وحواس کے قدم تھرتھراتے تھے۔ دربار میں پہنچ کر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجا لاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے کٹھرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اول شہزادوں کی نذریں گزرنی شروع ہوئیں ہر ایک کو خلعتِ ترقی منصب کے احکام سنائے گئے۔ سعد اللہ خاں وزیر اعظم کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔

۵۔ مکھیوں کے سردار کا احوال

انسان جس وقت اپنے کلام سے فارغ ہوا بادشاہ نے حیوانوں کی طرف خیال کیا ناگاہ ایک مہین آواز کان میں پہونچی دیکھا تو مکھیوں کا سردار یعسوب سامنے اُڑتا اور خدا کی تسبیح وتہلیل میں نغمہ سرائی کرتا ہے۔ پوچھا تو کون ہے اس نے کہا کہ میں

حشرات الارض کا بادشاہ ہوں۔ فرمایا تو آپ کیوں آیا جس طرح اور حیوانوں نے اپنے
قاصد اور وکیل بھیجے تو نے اپنی رعیت اور فوج سے کسی کو کیوں نہ بھیجا اس نے کہا کہ
میں نے اُن کے حال پر شفقت اور مہربانی کی تا کہ کسی کو کچھ تکلیف نہ پہونچے۔
بادشاہ نے کہا۔ یہ وصف اور کسی حیوان میں نہیں ہے تجھ میں کیوں کر پیدا ہوا۔ کہا
اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت اور مرحمت سے یہ وصف عطا کیا اس کے سوا اور بھی بہت سی
بزرگیاں اور خوبیاں بخشی ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔ کچھ بزرگیاں اپنی بیان کر کہ ہم بھی
معلوم کریں۔ اُس نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اور میرے جدو آبا کو بہت سی نعمتیں بخشیں
اور کسی حیوان کو اُس نے شریک نہیں کیا۔ چنانچہ ملک و نبوت کا مرتبہ ہم کو بخشا ہمارے
جدو آبا کو نسل درنسل اس کا ورثہ پہونچا یا یہ دو نعمتیں اور کسی حیوان کو نہیں دیں۔
اس کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم ہندسہ اور بہت سی صنعتیں سکھائیں کہ اپنے مکانوں کو
نہایت خوبی سے بناتے ہیں۔ تمام جہان کے پھل اور پھول ہم پر حلال کئے کہ بے خلش
کھاتے ہیں۔ ہمارے لعاب سے شہد پیدا کیا کہ جس سے تمام انسانوں کو شفا حاصل ہوتی
ہے۔ اس مرتبہ پر ہمارے آیات قرآنی ناطق ہیں اور ہماری صورت و سیرت اللہ تعالیٰ کے
صنعت و قدرت پر غافلوں کے واسطے دلیل ہے کیوں کہ خلقت ہماری نہایت لطیف اور
صورت عجیب ہے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں تین جوڑ رکھے ہیں۔ نیچے
کے جوڑ کو مربع کیا بیچ کے دھڑ کو لمبا، سر کو مدوّر بنایا۔ چار ہاتھ پاؤں مانند اضلاع
شکل مسدس کے نہایت خوبی سے مناسب مقدار کے بنائے جس کے سبب نشست و
برخاست کرتے ہیں اور گھر اپنے اس خوش اسلوبی سے بناتے ہیں کہ ہوا ان میں
ہرگز نہیں جا سکتی کہ جس کے باعث ہم کو یا ہمارے بچوں کو تکلیف پہونچے۔ ہاتھ پاؤں
کی قوت سے درخت کے پھل، پتے اور پھول جو کچھ پاتے ہیں اپنے مکانوں میں جمع
کر رکھتے ہیں شانوں پر چار بازو بنائے جن کی باعث اُڑتے ہیں اور ہمارے ڈنک میں

کچھ زہر بھی پیدا کیا ہی کہ اس کے سبب سے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہتے ہیں اور
گردن پتلی بنائی کہ دائیں بائیں سر کو بخوبی پھیرتے ہیں اور اس کے دونوں طرف
دو آنکھیں روشن عطا کی ہیں کہ ان کی روشنی سے ہر ایک چیز کو دیکھتے ہیں اور
مُنہ بھی بنایا ہی کہ کھانے کی لذّت جانتے ہیں ہونٹ بھی دیئے جن کے سبب
کھانے کی چیز جمع کرتے ہیں اور ہمارے پیٹ میں قوّتِ ہاضمہ ایسی بخشی ہی کہ وہ
رطوبات کو شہد کر دیتی ہے اور یہی شہد ہماری اولاد کے واسطے غذا ہی جس طرح
چارپایوں کے پستان میں قوّت دی ہی کہ خون مستحیل ہو کر دودھ ہو جاتا ہی غرض کہ
یہ نعمتیں ہم کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں اس کا شکر کہاں تک کریں۔ اس واسطے
ہیں نے رعیت کے حال پر شفقت اور مہربانی کر کے اپنے اوپر تکلیف روا رکھی
اور رعیت میں سے کسی کو نہ بھیجا۔

جس وقت یعسوب اپنے کلام سے فارغ ہوا بادشاہ نے کہا آفرین صد آفریں
تو نہایت فصیح و بلیغ ہی۔ سچ ہی کہ تیرے سوا یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کسی حیوان کو
نہیں بخشیں۔ بعد اس کے پوچھا تیری رعیت اور سپاہ کہاں ہے اُس نے کہا ٹیلے، پہاڑ،
درخت پر جہاں موقع پاتے ہیں رہتے ہیں اور بعضے آدمیوں کے ملک میں جا کر اُن کے
گھروں میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا اُن کے ہاتھ سے کیوں کر
سلامت رہتے ہیں کہا کہ بیشتر اُن سے چھپ کر اپنے تئیں بچاتے ہیں مگر کبھی جو وہ
قابو پاتے ہیں تکلیف دیتے ہیں بلکہ اکثر چھتوں کو توڑ کر بچّوں کو مار ڈالتے ہیں اور
شہد نکال کر آپس میں کھا لیتے ہیں بادشاہ نے پوچھا۔ پھر تم اس ظلم پر ان کے
کیوں کر صبر کرتے ہو۔ اس نے کہا ہم یہ ظلم سب اپنے اوپر گوارا کرتے ہیں اور کبھی عاجز
ہو کر اُن کے ملک سے نکل جاتے ہیں۔ اس وقت وہ صلح کے واسطے بہت حیلے پیش
کرتے ہیں۔ طرح طرح کی سوغات عطرِ خوشبو وغیرہ بھیجتے ہیں طبل اور دف...

بجاتے ہیں۔ غرض کہ انواع واقسام کے تحفے تحائف دے کر ہم کو راضی کرتے ہیں۔ ہمارے مزاج میں شر و فساد نہیں ہے ہم بھی اُن سے صلح کر لیتے ہیں اُن کے یہاں پھر چلے آتے ہیں اس پر بھی ہم سے راضی نہیں ہیں بغیر دلیل و حجت کے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مالک ہیں یہ غلام ہیں۔

۶- رنج و راحت

ملک بدن کے شہر قلب میں دو توام بھائی رنج و راحت نامی آباد ہیں اور اس قدر مشہور ہیں کہ اُن کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ ان بھائیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ راحت ایک خوش خلق، خوش رو، ہنس مکھ اور آرام پسند نوجوان ہے اور اس قدر ہر دل عزیز ہے کہ لوگوں کا گمان ہے کہ اس کے پاس موہنی ہے برخلاف اس کے رنج نہایت ترش رو، کریہہ منظر، مردم آزار اور بد مزاج ہے۔ لوگ اس کی صورت سے جلتے ہیں اُن کا بس چلے تو اُسے کچا کھا جائیں لیکن اُس کی مردم آزاری اور فتنہ پردازی سے اس قدر خائف ہیں کہ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ اُس کی طرف نظر بھر کے دیکھ سکے۔ اختلاف طبائع کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں میں اس قدر بیر ہے کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں اگرچہ وہ رہتے ایک ہی شہر اور ایک ہی مکان میں ہیں لیکن آج تک کسی نے انھیں یک جا نہیں دیکھا۔ رنج ہے تو راحت نہیں اور راحت ہے تو رنج نہیں۔ لوگوں نے ہر چند چاہا کہ دونوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے لیکن ایک کے آتے ہی دوسرا اس طرح نظروں سے غائب ہو جاتا ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے اس واقعہ کی خبر اقلیم بدن کے شہنشاہ دانش کو پہونچی۔ اسے بھی بڑی حیرت ہوئی اور کوتوال شہر تجسس

امی کو حکم دیا کہ اس معاملہ کی تحقیق کرکے رپورٹ پیش کرے۔ کوتوالِ شہر نے فوراً اپنے
جاسوس دوڑائے اور ایک مدّت کی جستجو اور سراغ رسانی کے بعد یہ دریافت ہوا کہ رنج و
راحت جو دو توام بھائی سمجھے جاتے ہیں اور جن کی نسبت لوگوں کے طرح طرح کے خیالات
ہیں وہ درحقیقت دو نہیں بلکہ ایک ہی شخص ہے جو کبھی رنج کے بھیس میں آتا ہے اور کبھی
راحت کی صورت میں لیکن یہ ساری کارروائی راز میں ہوئی اور کسی کو کانوں کان خبر
نہ ہونے پائی اور اس کا افشا کرنا اس لئے قرینِ مصلحت نہ سمجھا گیا کہ کہیں یہ لوگ برہم
نہ ہو جائیں اور اگر اس راز کو افشا بھی کر دیا جاتا تو بہت سے لوگوں کو یقین نہ آتا چونکہ
اب یہ راز پرانا ہو گیا ہے اور حالات بھی کچھ بدل گئے ہیں اس لئے میں اپنے اہلِ وطن کی
اطلاع کے لئے اس راز کو افشا کرتا ہوں کہ وہ دھوکے میں نہ رہیں اور رنج و راحت کو
دو نہ سمجھیں۔ درحقیقت یہ دونوں ایک ہیں۔

اکثر صاحبوں کو یہ پڑھکر اچنبا ہو گا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اغلب ہے کہ وہ میرے لکھے کو
باور نہ کریں لیکن اگر وہ ذرا غور کریں گے تو خود بخود اُن پر اصل حقیقت کھل جائے گی
ہم میں کون ایسا شخص ہے جسے یہ تجربہ نہیں ہوا کہ وہ چیز جسے وہ عین راحت سمجھتا اور
جس کی تمنا میں راتیں جاگتے اور دن روتے کٹے ہیں جب وہ حاصل ہو گئی تو معلوم ہوا
کہ جسے راحت سمجھتے تھے وہ دراصل مایۂ رنج اور وبالِ جان ہے اسی طرح ہمیں اکثر یہ بھی
تجربہ ہوا ہے کہ جس شے کو ہم رنج اور باعثِ کلفت سمجھتے تھے وہ درحقیقت موجبِ
راحت نکلی۔ پچھلے سال میں نے ایک اجنبی کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اعتبار کر لیا
اور آخر اُس نے مجھے نقصان پہونچایا۔ کیا درحقیقت یہ نقصان نقصان ہے۔ بظاہر
ایسا معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ سراسر نفع ہے۔ اس ایک نقصان نے
بیسیوں نقصانوں سے بچایا اور ایک ایسا بیش قیمت سبق سستے داموں ہاتھ آیا۔ برخلاف
اس کے ایک شخص کو گھر بیٹھے دولت مل گئی اس سے پہلے جو سعی اور محنت و مشقت

کرلیتا تھا وہ یکلخت ترک کردی اور راحت وآرام میں پڑگیا۔ راحت وآرام کے بڑھنے
سے افکار بڑھے، امراض بڑھے دماغ اور جسم دونوں پر اثر پڑا۔ خداداد دولت
بُرے اور لایعنی مصرف میں آنے لگی۔ اولاد اُس سے زیادہ سست اور کاہل ہوگئی
اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ڈبویا اور یہ راحت آخر کو رنج کی صورت میں نمودار ہوئی

ایک غریب مسافر صحرائے لق ودق میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ پیاس سے دم لبوں پر ہے
دُور سے ایک چشمۂ پُرآب اور نخلستان سرسبز نظر آتا ہے۔ پانی کے شوق اور سائے
کی آرزو میں قدم اُٹھائے ہوئے بڑھا چلا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے
چشمہ دُور ہوتا جاتا ہے۔ آخر تپتی ہوئی ریت پر بے تاب ہوکر گر پڑتا ہے۔ وہ خواب تھا یا
سراب تھا۔ زندگی کے اکثر پہلو ایسے ہی پُر اسرار ہیں۔ ٹھوکر کھا کر انسان سنبھلتا ہے
گر گر کر سوار ہوتا ہے۔ اکثر ناکامیاں کامیابی تک پہونچاتی ہیں اور بہت سی کامیابیاں
ناکامی سے بڑھ کر دل شکن ہوتی ہیں اُمید کا لہلہاتا ہوا کھیت تلپٹ ہوجاتا ہے اور
مایوسی مقصد تک پہونچا دیتی ہے

حیات کے معنی سعی وجدوجہد کے ہیں۔ سعی وجدوجہد میں رنج اُٹھانا پڑتا ہے اور
یہی رنج وراحت ثابت ہوتا ہے غرض اچھے وہی ہیں جو رنج وراحت کو ایک سمجھتے
اور ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

۷۔ قطب نما

قطب نما کو عربی میں ابرۃ القبلہ یا ابرۃ الملاحین اور انگریزی میں کمپاس
([illegible]) کہتے ہیں۔ یہ ایک آلہ ہے جو ایک دائرہ اور ایک سوئی پر مشتمل ہے۔
دائرہ کے مرکز میں سوئی افقی ہیئت پر ایک کیل میں جمی ہوتی ہے جو نیچے اوپر تو نہیں

ہٹ سکتی۔ البتہ چاروں طرف گھوم سکتی ہے۔ دائرہ کو عموماً چار خطوط کے ذریعے سے
چار حصوں پر تقسیم کر کے چار سمتیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ انگریزی ساخت کے قطب نما
میں مغرب کے لئے (W) مشرق کے لئے (E) جنوب کے لئے (S)
اور شمال کے لئے (N) استعمال کئے جاتے ہیں بعض قطب نما اور خاص کر جہازی
کمپاس میں چار حصوں کے علٰحدہ دائرہ میں درجوں کے نشان بھی پائے جاتے ہیں اور
شمال کے لئے ایک پھول ہوتا ہے۔ دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا آلہ ہے لیکن اصل میں بچھڑے
مسافرین کا رہبر اور گم کردگان کے لئے خضرِ رہ نما ہے۔ لق ودق بیابانوں اور صحراؤں
میں یہ ہاتف غیب کا کام دیتا ہے۔ گھنے جنگلوں اور پیچ در پیچ دریاؤں کی
صحیح سمتوں کا معلوم کرنا اکثر اسی آلہ پر منحصر ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شاید
دنیا بھر کے مکمل نقشے اس سہولت سے مرتب نہ ہو سکتے۔ زمین کے اندر ہی اندر سرنگیں
لگانا زیادہ تر اسی پر موقوف ہے کیوں کہ سطح زمین پر ستاروں یا دیگر علامات اور نشانات
سے قطب نما کے بغیر سمتوں کے معلوم کرنے میں شاید کچھ کام چل جائے لیکن زمین کے
اندر جہاں نہ کوئی ستارہ نظر آسکتا ہے نہ کوئی علامت کام دیتی ہے صحیح سمت اکثر
قطب نما ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور جب تک سمت معلوم نہ ہو سرنگ کا خاطر خواہ تیار
ہونا محال ہے۔ ذخّار سمندروں میں جہاں فقط نیچے پانی اور اوپر آسمان نظر آتا ہے۔
سمتیں دریافت کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی تھیں اس آلہ کی ایجاد سے قبل
جہازراں ساحل سے قریب ہی قریب منڈلاتے پھرتے تھے اور دور دراز نکل جانے
سے جھجکتے تھے۔ بعض اوقات جب مطلع صاف ہوتا تو رات کے وقت سمتیں دریافت
کرنے میں ستاروں سے مدد لی جاتی تھی لیکن ابر اور کہر وغیرہ کی حالتوں میں اس
مقصد کے لئے وہ بھی بالکل معذور تھے۔ جب انسان پر مقناطیسی خاصیت کا راز
منکشف ہو گیا اور قطب نما کے ذریعہ سے ایک سمت معلوم ہو گئی تو دوسری سمتوں کا

معلوم کرنا آسان ہوگیا۔ اس لئے ملاحوں کو خشکی سے دُور دراز نکل جانے پر بھی بھٹکنے کا مطلق اندیشہ نہیں رہا۔ وہ بڑے بڑے دعاوے مارنے کی جرأت کرنے لگے من چلے ملّاح مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو پہونچتے ہیں اس کی بدولت کامیاب ہوئے۔ کولمبس نے اس کے برتے پر اس قدر بڑے اور اہم سفر کے لئے کمر ہمت باندھی اور نئی دنیا کے دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے علاوہ آج تک جتنے بڑے بڑے سفر اور نمایاں تحقیقاتیں ہوتیں ہوں وہ سب اس آلہ کی بدولت ہوئیں آج دنیا بھر کے جہازات وغیرہ جو سمندروں میں پھیلے پڑے ہیں وہ سب اسی کی بدولت ہیں۔ قطب نمائی ایجاد نے فن جہاز رانی میں جان ڈال دی اور انسان کو ناپیدا کنار سمندروں کا مالک بنا دیا۔ چوں کہ قطب نما کو جس قدر خاص تعلق زمانۂ قدیم سے فن جہاز رانی سے رہا ہے اتنا دوسرے امور سے نہیں رہا اس لئے عربی میں اس کو ابرۃ الملاّحین کہتے ہیں ابرۃ کے معنی طرف باریک کے ہیں۔

قطب نما اصل صرف اس کی سوئی ہے جو ہمیشہ قطبین یعنی شمال اور جنوب کو بتاتی رہتی ہے اگر اس کو کسی اور طرف پھیر دو تو پھر سکتی ہے مگر مانع زائل ہوتے ہی وہ اپنی اصلی سمت کی طرف پلٹ جائے گی۔ سوئی میں یہ خاص میلان پیدا کرنے والی چیز مقناطیسی یا برقی قوت ہے۔ یہ قدرت کا ایک کرشمہ ہے کہ اصلی یا مصنوعی مقناطیس کے معلق ہوتے ہی اس کا رُخ قطب کو ہو جاتا ہے اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر اصلی مقناطیس نہ ملے تو مصنوعی مقناطیس لو جو بازار میں نعل کی شکل کا ایک فولاد کا ٹکڑا ملتا ہے۔ اس میں برقی بیٹری کے ذریعے سے برقی قوت بھر دی جاتی ہے اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ جب کچے لوہے کو برقی بیٹری سے متصل کرتے ہیں تو اس میں بھی برقی یا مقناطیسی قوت سرایت کرجاتی ہے اور وہ لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے لیکن جب بیٹری سے جدا کر لیتے ہیں تو پھر اس کا وہ اثر باقی نہیں رہتا اور اگر پکّے لوہے یعنی فولاد میں برقی اثر سرایت

کرجائے تو اُس میں باٹری سے جدا کرنے کے بعد بھی وہی اثر باقی رہتا ہے اور اپنی قوت کے
موافق لوہے کی کیلوں یا سوئیوں وغیرہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس طرح سوئی مقناطیس
اگر کوئی فولادی چیز رگڑ دی جائے تو اس میں بھی وہی اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک
فولادی معمولی سوئی لو اور اس کو اس مقناطیس پر ذرا گھس دو تو کچھ عرصہ کے لئے
اس میں برقی یا مقناطیسی اثر سرایت کرجائے گا۔ اس سوئی کو ریشم میں باندھ کر لٹکا دو
یا کاگ یا کسی اور ہلکی پانی پر تیرنے والی چیز کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں چبھو کر پانی پر
چھوڑ دو تو وہ سوئی تیرتی ہوئی برابر قطبین کو بتائے گی گویا قطب نما کا کام دے گی
اس تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقناطیسی رخ ہمیشہ قطبین کی جانب رہتا ہے مگر یہاں ایک
اور بات قابل لحاظ ہے کہ سوئی کا ہر سرا ایک قطب سے مخصوص رہے گا یعنی جو سرا شمال
کی جانب ہے وہ جنوب کی جانب اور جو جنوب کی طرف ہے وہ شمال کی طرف کبھی نہیں ہو سکتا
اس کی وجہ یہ ہے کہ برقی یا مقناطیسی قوت کی دو قسمیں ہیں ایک موجبہ دوسری
سالبہ، جس سوئی کو مقناطیس پر گھس کر مقناطیسی اثر اس میں پیدا کیا گیا ہے اس میں
بھی دونوں قسم کی قوتیں موجود ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں ایک سرے
میں موجبہ قوت ہوگی اور دوسرے میں سالبہ ہوگی اور اُن کا نقطہ اتصال سوئی
کے بیچوں بیچ میں ہوگا۔ موجبہ کا رخ ہمیشہ قطب شمالی کی جانب اور سالبہ کا قطب جنوبی
کی طرف رہے گا یا یوں کہنا چاہیئے کہ جو سرا قطب شمالی کی جانب ہے اس کو موجبہ
کہتے ہیں اور جو قطب جنوبی کی طرف ہے اس کو سالبہ کہتے ہیں۔ اس کا امتحان یوں ہو سکتا
ہے کہ اسی پانی پر جو تیرتی ہوئی یا ریشم میں لٹکتی ہوئی مقناطیسی سوئی کا جو سرا شمال کی
جانب ہے اس کو پھیر کر جنوب کی طرف کر دو تو وہ اُس طرف پھیرنے کا یقین ہوتے ہی
وہ پھر اصلی سمت کی طرف فوراً پلٹ جائے گا

۸ - سمجھ

سمجھ یعنی تمیز جس سے بھلائی برائی میں امتیاز کیا جاتا ہی۔ میرا یہ خیال ہی کہ اگر
انسانوں کے دلوں کو چیر کر دیکھا جائے تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں
تھوڑا ہی سا فرق نکلے گا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بیہودہ خیال
آتے ہیں بے شمار وسوسے دونوں کے دلوں میں ہوتے ہیں مگر ان دونوں میں یہی فرق
ہوتا ہی کہ دانا آدمی ان سے انتخاب کرتا ہی اور سمجھتا ہی کہ کون سے خیالات ایسے ہیں جن کو
گفتگو میں لانا چاہیئے اور کون سے ایسے ہیں جن کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ نادان آدمی ایسا
نہیں کرتا اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہی بے سوچے سمجھے مُنہ سے بکتا جاتا ہے
دانشمند آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کے مانند ہوتا ہی جو
اس کے دل میں آتا ہی بے تردد دوست سے کہتا ہی گویا اُس کو خیالات ہی ایک بلند
آواز میں آتے ہیں۔ بیٹلی صاحب کا قول ہی کہ انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا
برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح
برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے
اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہی وہ نہایت عمدہ ہی مگر پچھلی بات جو دوست
کے ساتھ برتاؤ کی ہی وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی کچھ بات نہیں ہی بلکہ نری مکاری ہے
ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہی۔ اپنے دلی دوستوں
سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ سچ ہی کہ بعضے دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور
دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انھیں کو دغا باز اور برا کہتی ہی اور دوست پر
بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی۔ ہاں البتہ دوستوں کو منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے۔
سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہی بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہی اور

گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما اور ہمارے لئے قادر مطلق خدا کی نائب ہی۔ انسانوں میں بہت سی بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں مگر سمجھ سب سے زیادہ مفید ہی۔ سمجھ ہی کے سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہی سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں وہ صفتیں ہیں ان صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہی۔ سمجھ بغیر علم اور عقل دونوں ناچیز ہیں۔ باوجودے کہ انسان میں نہایت عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں مگر بغیر سمجھ ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہی اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہی۔ سمجھ ہونے سے صرف انھیں خوبیوں کا جو اس میں ہیں مالک نہیں ہوتا بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں ان کا بھی مالک بن جاتا ہی۔ سمجھ دار آدمی جس سے گفتگو کرتا ہی اس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہی اور اسی کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ ہر ایک مجلس میں نہ کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہی اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہی جس کو سمجھ ہی اور جو اہل مجلس کی لیاقتوں کو اور جو بات کہنی ہی اور جو نہ کہنی ہی اُس میں تمیز کر سکتا ہی جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو پر سمجھ نہ ہو وہ ایک نہایت قوی اور زبردست پر اندھے آدمی کی مانند ہی جو بسبب اپنے اندھے پن کے اپنے زور و قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہی۔ گو ایسے شخص کو دنیا میں اور سب طرح کمال حاصل ہوں مگر سمجھ نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے اگر اس کی سمجھ پوری ہو اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو اور باقی اوصاف متوسط درجہ کے رکھتا ہو تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے کر سکتا ہی۔

سمجھ جس طرح انسان کے لئے ایک بہت بڑا کمال ہی اسی طرح اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہی۔ نیک دل کی منتہائے خوبی سمجھ ہی اور بد دل کی منتہائے بدی مکر یا یوں کہو کہ وہ نیک دل کے لئے معراج ہی اور یہ بد دل کے لئے کمال سمجھ نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہی اور اُن کے حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم

کرتی ہی۔ مگر یہ صرف خود غرضی ہوتی ہی۔ سمجھ مثل ایک روشن آنکھ کے ہی جس میں بے انتہا
وسعت ہی اور تمام دنیا کو اور دُور دُور کی چیزوں کو آسمانوں کو اور آسمانوں کے ستاروں کو
بخوبی دیکھ سکتی ہی۔ مگر مثل ایک کوتاہ نظر آنکھ کے ہی جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتا
ہی اور دُور کی چیزیں گو وہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں اُسے نظر نہیں آتیں۔ تجربہ جس قدر
ظاہر ہوتی جاتی ہی اُسی قدر انسان کا اختیار اور اعتبار بڑھتا جاتا ہی مگر کاٹھ کی ہنڈیا کی مانند
ہی کہ جب ایک دفعہ کھل گیا تو پھر اس کی قوّت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہی۔ پھر انسان
کسی کام کا نہیں رہتا جو کام کہ وہ ایسی حالت میں کرسکتا جب کہ لوگ اس کو ایک سیدھا سادھا
بھولا بھالا آدمی سمجھتے اب وہ کام بھی وہ نہیں کرسکتا سمجھ عقل کے لئے کمال ہی اور ہمارے
کاموں کے لئے رہ نما۔ مگر ایک قوّت ہی جو حال ہی کے فائدوں کو دیکھتی ہی۔ سمجھ نہایت عقلمند
اور نیک آدمیوں میں پائی جاتی ہی۔ مگر اکثر جانوروں میں اور ان لوگوں میں جو جانوروں کی
مانند یا اُن سے کچھ بہتر ہوتے ہیں پایا جاتا ہی۔ سمجھ نفس الامر میں ایک نہایت خوب صورت
دل کش چیز ہی اور مکر گویا اُس کی بگاڑی ہوئی نقل ہی۔ سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ
زمانۂ حال اور استقبال دونوں پر لگی رہتی ہی۔ جو باتیں کہ زمانۂ دراز کے بعد ہونے والی
ہیں اور جو اب ہو رہی ہیں دونوں کو دیکھتا ہی۔ وہ جانتا ہی کہ رنج و خوشی جو دوسری زندگی
میں یعنی قیامت میں ہونے والی ہی وہ بے شک ہوگی۔ گو اس کا زمانہ ابھی بہت دُور ہی۔
وہ اُس کے دُور ہونے کے سبب سے اس لئے اس کو حقیر نہیں سمجھتا کہ دوسری زندگی یعنی قیامت
کی تکلیف و راحت لمحہ لمحہ پاس آتی جاتی ہی اور اسی طرح سے رنج و خوشی دیویں گے جیسے کہ
زمانۂ حال میں رنج و خوشی ہوتی ہی اس لئے وہ نہایت غور و فکر سے ان خوشیوں کے ہاتھ
آنے کے لئے کوشش کرتا ہی جو اس کے لئے قدرت نے بنائی ہیں اور جن کے لئے وہ
پیدا کیا گیا ہی۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام تک دوڑاتا ہی اور اس کے حال و قال کے
نتیجوں پر غور کرتا ہی اور اس فانی دنیا کے تھوڑے سے نفع اور فائدے کو اگر درحقیقت

وہ نفع اور فائدہ اسی کی سچّی عاقبت کے خیال کے مخالف ہو چھوڑ دیتا ہے۔ غرض کہ اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں اس کا رویّہ ایسے شخص کی مانند ہوتا ہے جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے اور اُس کے حاصل کرنے کا مناسب طریقہ بھی جانتا ہے۔ سمجھ جس کو میں نے اسی مضمون میں بطور ایک نیکی اور کمال کے بیان کیا ہے وہ صرف دنیا ہی کے کاموں کے لئے مفید نہیں ہے بلکہ ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے بھی فائدہ مند ہے وہ صرف اس فانی انسان کے لئے ہی رہنما نہیں ہے بلکہ اس اصلی ناقانی انسان کے لئے بھی جو ہم میں بولتا ہے رہنما ہے بعض مصنف اسی کو عقل کہتے ہیں اور بعض سمجھ یعنی تمیز جن سے اچھے و بُرے اور بھلائی و بُرائی میں امتیاز کیا جاتا ہے حقیقت میں یہی چیز سب سے بڑی ہے اس کے فائدے بے انتہا ہیں اور پھر اس کا ہاتھ آنا نہایت آسان ہے۔ ایک مصنف کا قول ہے کہ سمجھ ہی ایسی رونق کی چیز ہے جس کو کبھی زوال نہیں جو اس کو چاہتے ہیں آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں جو اُس کو ڈھونڈھتے ہیں وہ آسانی سے پاتے ہیں اُس کی تلاش میں اُن کو بہت دُور جانا نہیں پڑتا کیوں وہ اس کو اپنے ہی دروازہ پر پاتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال حاصل کرنا ہے جو کوئی اس پر خیال رکھتا ہے اُسی دم جستجو سے چھوٹ جاتا ہے کیوں کہ وہ خود ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے اور جو اُس کے لائق ہیں اُن کو رستہ ہی میں ملتی ہے اور پھر کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

۹۔ آداب طالب علم

پہلا ادب۔ طالب علم اور شغلوں کے تعلقات کو کم کرے۔ ہو سکے تو سب اپنے عزیز و اقارب اور وطن سے دُوری اختیار کرے۔ اس لئے کہ ایسے سب علاقے تحصیل علم کے حارج اور مانع ہیں اور کسی انسان کے دو دل نہیں ہوتے پس جب دل بٹا رہے تو تحصیل علم کے اندر قصور رہے گا۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ علم تجھ کو اپنا تھوڑا حصّہ دے گا جب تک تو اس کو

اپنا سب دل و جان حوالہ نہ کرے گا۔ غرض جب آدمی کا ذہن سب کاموں میں بٹا رہتا ہے
اس کا حال نالے کا سا ہوتا ہے جس کا پانی پھیل گیا ہو کہ کچھ زمین پی جاتی ہے اور کچھ ہوا
دیتی ہے تو اس میں اتنا پانی نہیں رہتا کہ اکھٹا ہو کر کھیتی میں پہونچے۔

دوسرا ادب کہ علم پر تکبر نہ کرے اور نہ استاد پر حکومت کرے بلکہ اپنے معاملہ کو
ہر حال میں بالکل استاد کے اختیار میں چھوڑدے اور اس کی نصیحت کو ایسا مانے جیسے جاہل
بیمار طبیب شفیق و حاذق کو مانتا ہے۔ استاد سے چاہیئے کہ انکسار کے ساتھ پیش آئے اور اس کی
خدمت کو اپنا شرف جانے۔ طالب علم کو تکبر کرنا زہر ہے۔ کبھی تکبر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی مشہور
عالم سے پڑھیں اور دوسرے عالموں سے پڑھنے سے کنیائیں۔ یہ امر عین حماقت ہے علم ہر عالم سے
حاصل ہوسکتا ہے۔ غرض علم کو تکبر سے تنفر ہے۔ علم بغیر انکسار اور کان لگانے کے نہیں آتا جو کان
میں ڈالا جائے اس کو اچھی طرح سن کر خوشی کے ساتھ قبول کرے۔ استاد کے سامنے
شاگرد کو چپ رہنا چاہیئے جیسے نرم زمین جس پر بہت سا مینھ برسے اور وہ سب پی جائے
ایسے ہی جو استاد بتائے اس کو قبول کرے اور اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دے جو
شاگرد اپنے استاد کی رائے کے سامنے اپنے آپ رائے اور اختیار باقی رکھے گا تو وہ اپنی
حاجت سے محروم رہے گا۔ بے شک استاد سے پوچھنا چاہیئے اور جو اپنی سمجھ میں آئے
وہ کہنا چاہیئے۔ مگر استاد جہاں تک پوچھنے کی اور اپنی اظہار رائے کی اجازت دے
اور جن چیزوں کے استفسار کو کہے وہاں تک یہ کام جائز ہے۔ ایسی بات پوچھنی کہ جس کے
سمجھنے کا رتبہ ہم کو حاصل نہیں ہوا ہے برا ہے۔ جس چیز کے بتانے کا وقت ہوتا ہے وہی وقت
اس کے پوچھنے کا۔ استاد کے جواب میں اس کو طعنہ مت دو۔

تیسرا ادب۔ طالب علم ابتدا میں ایسے امور کے سننے سے احتراز کرے کہ
جس میں اختلاف آرا ہو اس لئے کہ اختلافوں کے سننے سے مبتدی کی عقل متحیر اور ذہن
پریشان اور رائے سست ہو جاتی ہے اور ادراک اور اطلاع سے یاس ہو جاتا ہے بلکہ اس کو چاہیئے

کہ اول ایک عمدہ طریقہ سے یہی بات جو استاد کے نزدیک پسندیدہ ہے اس کو یقین کرلے اور پھر اس کے بعد جو اختلافات ہوں ان کو سنے۔ اگر استاد کی رائے اچھی نہ ہو تو یہ مجبوری ہے

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

غرض مبتدی کو منتہیوں کی رائے میں دخل دے کر اپنے دل میں شبہات نہ پیدا کرنے چاہئیں۔ جس سے خاطر پریشان ہو۔

چوتھا ادب۔ طالب علم عمدہ علوم سے کوئی فن بدون دیکھے نہ چھوڑے اور اس پر دیکھے کہ اس کے مقصود اور علت غائی سے مطلع ہو جائے پھر اگر زندگی وفا کرے تو اس میں کمال پیدا کرنے کا طالب ہو اور جو ان میں اہم معلوم ہو اول سیکھ کر اس میں کمال پیدا کرے۔ غرض کسی ایک علم میں کامل ہو اور باقی علوم میں سے تھوڑا تھوڑا حاصل کرے کیوں کہ علوم ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور آپس میں وابستہ ہیں قاعدہ ہے کہ جو چیز آدمی کو نہیں آتی اس کا دشمن ہوتا ہے اس لئے آدمی جانے کہ کوئی علم مجھے جو اچھا نہیں معلوم ہوتا وہ میرے جہل کے سبب ہے۔ جیسے مریض کا منھ کڑوا ہو تو میٹھا پانی بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے ایسے ہی میرا مذاق اس علم کے لئے درست نہیں مجھے وہ برا معلوم ہوتا ہے۔

پانچواں ادب۔ علوم و فنون کو بالترتیب سیکھے جو ضروری وجہ معاش کے لئے زمانہ کے موافق ہوں ان کو اہم سمجھ کر اول سیکھے یہ کچھ ضرور نہیں کہ اس میں کمال ہی حاصل کرے۔ غرض جو کچھ حاصل کرے وہ عمدہ علم ہو اور تھوڑے ہی پر قانع ہو اور اس سے جو قوت حاصل ہوئی وہ سب اس علم کے پورا کر دینے میں صرف کر دے۔ علوم کو وہ یہ دیکھے کہ اس کا ثمرہ کیا ہے اور اس کا شرف کیا ہے۔

چھٹا ادب۔ علم کا مقصد سر دست یہ ہو کہ میں اس سے اپنے باطن کو آراستہ اور فضیلت سے مزین کروں تحصیل معاد و معاش میں عقل بڑھاؤں۔ شاگرد میں تین باتیں ہونی ضرور چاہئیں۔ جن سے کہ وہ کتاب سے پوری تعلیم پا سکتا ہے۔ اول عقل، دوم ادب، سوم اچھی سمجھ۔

۱۰- استقلال

استقلال! خدا کی قسم تو بھی دنیا کے انتخاب میں کیا ہی لاجواب چیز ہے۔ مشکلوں پر مشکلیں پڑتی جاتی ہیں، بنے ہوئے کھیل بگڑے جاتے ہیں، ہمت جواب دے رہی ہے۔ جرأت پیچھے قدم ہٹا رہی ہے۔ ناامیدی کا ابر اُٹھ رہا ہے۔ یاس کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بے قابو ہو کر گرے پڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر سلامتی سے ادھر تیرا قدم درمیان میں آیا اور سب مشکلیں آسان ہو گئیں۔ اعضا میں پھر نئے سر سے توانائی آگئی۔ گئے ہوش و حواس پھر آئے روح میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی خون میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ ہمت ہار دینے والا سنبھل بیٹھا اور پھر استقلال سے اپنا کام کرنے لگا۔

دیکھو وہ ایک مشتِ استخواں آدمی کھڑا ہے۔ آپ اس کو پہچانتے ہیں؟ یہ فرہاد ہے اس کے ہاتھ میں ایک بالشت بھر لوہے کا ٹکڑا ہے جس کو تیشہ کہتے ہیں۔ اس کے سامنے جو چیز زمین کے بہت بڑے حصے کو گھیرے ہوئے آسمان سے باتیں کر رہی ہے اس کو پہاڑ کہتے ہیں۔ جو واقعی پہاڑ ہے پتھر کی طرح اور وہ بندۂ خدا تنِ تنہا اسی تیشہ سے اس پہاڑ کو کاٹ رہا ہے۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں باقی ہے عقل کہتی ہے بے وقوف ہوا ہے۔ پہاڑ بھی ایک مشتِ خاک سے کہیں کٹا ہے۔ ناامیدی بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آکر اس کی رہی سہی قوت سلب کر لیتی ہے اور یہ سر تھام کر رہ جاتا ہے۔ ماتھے سے ٹپکتا ہوا پسینہ پونچھتا جاتا ہے اور ایک ہاتھ جب شل ہو جاتا ہے تو دوسرے ہاتھ میں تیشہ لے کر پہاڑ پر دے مارتا ہے۔ پتھر کے ریزے اُچھل اُچھل کر بعض اوقات اس کی آنکھیں بھی بند کر دیتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح مونھ نہیں موڑتا اور اسی طرح استقلال کے ساتھ اپنا کام کیے جاتا ہے۔ آخر آپ نے سنا کہ

[illegible] کر دکھایا؟ اس کی محنت میں کامیابی ہوئی۔ پہاڑ کٹ گیا اور
[illegible] جاری ہوگئی! مگر تم نے کچھ اس پر غور کیا کہ یہ پہاڑ آخر کٹ
[illegible] کے ہاتھ تو کاٹتے کاٹتے رہ گئے تھے۔ پہاڑ کی سختی دیکھ کر تیشہ کی
باڑھ کا منھ مڑ گیا تھا کاٹنے والے کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ اس کی ہمت دل کے
گوشوں میں منھ چراتی تھی۔ مگر ہاں ایک اس کا استقلال تھا جس نے اس کی ساری
مشکلوں کو آسان کر دیا اور وہ استقلال کے ساتھ پہاڑ کو کاٹتے ہی گیا۔

گو اس موقع پر چند ایسے حرماں نصیب لوگوں کی بھی افسوس ناک مثالیں ملیں گی جنھوں نے
استقلال سے کام تو بہت کچھ لیا مگر اس استقلال نے اُن کو کچھ کام نہ دیا زمانہ نے گو اُن کے ساتھ
بہت مخالفت کی اور نہایت بے قدری کے ساتھ ان کے اس استقلال کو دیکھا مگر ان کی
حرماں نصیبی پر ہمیشہ رونے کے لئے ایک عالم کی آنکھیں تیار رہیں گی۔ کرنے والے کو سب
اچھا ہی کہیں گے اور جو کوئی کچھ کہے گا بھی وہ زمانہ ہی کو کہے گا۔

ہمارے کام اکثر ناتمام اور ادھورے رہتے ہیں جس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ بے چین
طبیعت والوں کو دل میں اکثر دیکھا دیکھی جوش تو طرح طرح کے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن
ان کا قیام دریا کی اُٹھتی ہوئی موجوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ادھر ایک لہر آئی اور مٹ گئی
دوسری موج آئی اور وہ بھی ساحل فنا سے ٹکرا کر معدوم ہو گئی۔ اسی طرح ہماری عمر تو
ختم ہو جاتی ہے اور کام ایک بھی پورا نہیں ہوتا۔ انسان جس کام کو شروع کرے اس میں اس کو
استقلال سے کام لینا چاہئیے۔ ورنہ بہت سے پیش آنے والے موانعات قدم قدم پر اس کا
دامن پکڑنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ فرانس کے مشہور فاتح نپولین بونا پارٹ کے عہد میں
"غیر ممکن" کا لفظ لکھنا جرم تھا اس کا قول تھا کہ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو انسان
کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔ مگر ہاں استقلال شرط ہے۔ ایک مرتبہ نپولین نے ایک ایسی غیر معروف
اور دشوار گزار راستے سے آسٹریا کے فتح کرنے کا قصد کیا جس میں آلپس پہاڑ کا ختم

نہ ہونے والا سلسلہ برف سے ڈھکا ہوا گزرنے سے روک رہا تھا اس کے سب لشکری ہمت ہار بیٹھے اور کسی طرح یہ خیال میں نہ آسکتا تھا کہ اتنا بڑا لشکر اس راستہ سے گزر سکے گا مگر فتحمند نپولین کو اس کی جنگی لیاقت نے اس امر کا اچھی طرح یقین دلایا تھا کہ آسٹریا کا کل ملک اگر فتح ہوسکتا ہے تو اسی راستہ سے۔ اس نے اپنی فوج کو یہ قطعی حکم سنا دیا کہ اسی راستے سے چلنا ہوگا اور جب استقلال کے ساتھ وہ اپنی اس رائے پر قائم رہا تو پھر یہ دیکھا گیا کہ گو اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ اس راستہ کی نذر ہوگیا۔ مگر برف کاٹ کاٹ کر آسٹریا جانے کا راستہ بنا لیا اور اس کے استقلال ہی کی وجہ سے آسٹریا کی فتح اس کو نصیب ہوئی۔

۱۱۔ سرسیدؒ کے اخلاق اور عادات

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں بولے جاسکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اعلیٰ درجہ کا دل و دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیوں کہ لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسید میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اس کو خدائے تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجہ کے عنایت کیے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل۔ لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اس کے اخلاق رذائل سے پاک معلوم ہوتے تھے۔ اسی لئے مسٹر بک نے اس کے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ "گو اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق ان سے بھی بڑے تھے۔"

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو بات

کا پکا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، محنتی ہو صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے۔" اِس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسید کے حق میں جامع و مانع ہوگی۔ جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا جس قدر اُس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اُس کے مدّاح اور ثنا خواں تھے۔ سب اُس سے محبت رکھتے تھے۔ سب کو اُس پر اعتبار تھا اور سب کو اُس کا دنیا سے اٹھ جانا ایسا ہی شاق گزرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مربّی اور سرپرست کا مرجانا شاق گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حُسنِ اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

سب سے بڑی دلیل اس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُس کو اپنے مقاصد میں ہوئی۔ کیوں کہ لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاق نہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کی پبلک لائف میں بسر کیے جس میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے ادنیٰ ادنیٰ کام دیکھنے کا موقع ملا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسید کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے۔ اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہو جائے یا وجود اس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا۔

اُس کے اخلاق کا اُس کے ہم نشینوں اور جلیسوں پر اثر پڑتا تھا اُس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔ اُس کی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی اُس کی سچائی اور ہمّت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اس کے

پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی کیرکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں، جیسے صدق راستبازی۔ مودت، جمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی"۔ اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اُس نے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا جس بات پر دل سے یقین کر لیا اسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ اُن کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنی کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُن کو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اس کو متنبہ کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان کا ایک دوست جو اخبار کا ایڈیٹر تھا اُس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے جب وہ پرچہ سرسید کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اُس کو لکھا کہ "کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اُس کو سچ جانتا ہے یا نہیں اگر نہیں جانتا اور اُس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھ کو معاف کیجئے گا بہ سبب اس کے کہ

آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔"

جب ان کے ایڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اس کا جواب اُنھوں نے اس طرح لکھا ہے "میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں، خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجہ پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے، ایسی ہی پرائیویٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے۔"

مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُن کی رفیق رہی۔ جس زمانہ میں وہ فتح پور سیکری میں منصف تھے اُس وقت مولانا نور الحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسیّد کی اُن سے نہایت گہری دوستی تھی مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے سمجھنے کے لئے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتح پور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ اُن کا یہی دستور رہا وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتح پور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسیّد کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لئے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملہ اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں، بلکہ اُن کا مطلب صرف مصنّف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا جو بات کتاب میں اُن کے کام کی ہوتی تھی اُس پر پنسل سے نشان کر دیتے تھے اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا چپاں کر دیتے تھے۔ جو مہتم بالشان سوالات ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے اگر اُن کے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار میں نظر پڑ جاتا تھا

اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم
کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اس پر چھوٹا یا بڑا آرٹیکل لکھ کر چھپنے کو بھیج دیتے
تھے جو مضمون ان کے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے اُن کو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے
تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سُناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کی بعض خبریں یا نوٹس یا کوئی
ضروری آرٹیکل کسی انگریزی داں سے پڑھوا کر سُن لیتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اُس کا
ترجمہ کرا لیتے تھے۔ تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آجاتا اور زیادہ غور
کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں بالکل مستغرق ہو جاتے تھے چہرہ عبوس ہو جاتا
تھا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا تھا، لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُن کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی کبھی
ایسے موقع پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اسی
خیال میں منہمک رہتے تھے۔ جب عقدہ حل ہو جاتا فوراً چہرہ پر بشاشت آجاتی اگر اس وقت
کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا ساختہ اُس کے روبرو بیان کرتے۔ اگر اور
لوگ بھی اُس کو پسند کرتے تو خوش ہوتے۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو اُس پر بحث کرتے
یا خاموش ہو جاتے مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

اور محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔
قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے اُن کو کام کرنے کی عادت رہی اُن کے قوٰی میں فطرۃً مشکلات
کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی
اور بظاہر اُن کی غیر معمولی ذہانت بھی اُن کی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا کیونکہ
بچپن میں جیسا کہ خود سرسید کے بیان سے معلوم ہوا ہے وہ باعتبار ذہانت اور جودت
کے اپنے ہم چشموں میں کچھ امتیاز نہ رکھتے تھے۔ مگر چونکہ اُنھوں نے اپنے تمام قوائے جو
خدائے تعالیٰ نے اُن کے نفس میں ودیعت کئے تھے پورا پورا کام لیا تھا اس لئے اُن
کے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جلا ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا

نہیں معلوم ہوتا تھا جب اس سے بڑے بڑے کارنمایاں ظاہر ہوئے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی نئی باتیں کیوں کر نکالیں تو اُس نے یہی جواب دیا کہ "میں استقلال سے برابر غور کرتا رہا" محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکما کو شبہ ہوگیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟

بہرحال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کی جلا کرنے والی اور اُن کی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی اُن کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ "جس زمانہ میں سید صاحب دلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ پڑھنے کے لئے گیا تھا مگر اس رفتار سے اُن کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے فارغ ہو کر سو رہتے۔ کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے۔ اس کے بعد ہمیشہ بلا ناغہ اُٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے جب تک میں رہتک میں رہا برابر اُن کا یہی قاعدہ دیکھا۔"

یہ تو اس زمانہ کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۳۶ سال کی تھی اُس سے آٹھ نو برس بعد مراد آباد اور غازی پور میں بھی جب کہ وہ تبیین الکلام لکھتے تھے اُن کی محنت کا حال جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُسی کے قریب قریب تھا۔

جس زمانہ میں سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا شام تک لو چلتی تھی وہ کچہری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہونچتے تھے۔ اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں بیان

کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لے جاتے تھے۔ میرا گرمی اور لُو کے مارے بُرا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ اور لُو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانہ میں جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا اُن کی محنت جوانی اور کہولت کے زمانہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اس پیادہ سیّاح کی طرح جو سراسر ملک میں سیاحت کیلئے داخل ہو جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے اسی قدر اُن کی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی اُن کا اس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل تھا کہ "ضاعف فی الکبر همتك فان وقتك قد دنیٰ وعما قلیلٍ لتدعیٰ (یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دوچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آپہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاؤ ہونے والی ہے)

۱۲۔ جشنِ نوروزی

نوروز ایک عالم افروز دن ہے کہ ایشیا کے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اُسے عید مانتے ہیں اور بالفرض کوئی بھی نہ مانے تو بھی موسمِ بہار کا ایک قدرتی جوش ہے کہ اپنے وقت پر خود بخود ہر دل میں ذوق و شوق پیدا کرتا ہے۔ یہ امر کچھ انسان یا حیوان پر منحصر نہیں بلکہ اس کا اثر ہر شے میں جان ڈال دیتا ہے انتہا ہے کہ مٹی میں سبزی اور سبزی میں گلکاری کرتا ہے پس اسی کا نام عید ہے۔

ترک چنگیزی کہ کچھ مذہب نہ رکھتے تھے اور جاہل محض تھے باوجود اس کے ادنیٰ صاحب مقدور سے لیکر امرا و بادشاہ تک اُس دن گھروں کو سجاتے تھے۔ خوانِ یغما لگاتے تھے سب مل کر لوٹتے لٹاتے تھے اور اُسے سال بھر کے لئے مبارک شگون سمجھتے تھے۔ ایرانی پہلے بھی مانتے تھے۔ زرتشت نے آکر اس پر مذہبی سکّہ لگایا کیوں کہ اُس کے خیالات

کے بموجب آفتاب سب سے روشن دلیل خداشناسی اور حق جوئی کی ہے ہندو بھی اس خیال میں ان سے متفق ہیں خصوصاً اس جہت سے کہ اُن کے بعض مہاراجگان جلیل القدر کے جلوس اور اکثر بڑی بڑی کامیابیاں اسی دن ہوئی ہیں۔

اکبر کو انھیں فرقوں سے تعلق تھا اس لئے وہ بھی نوروز کے دن جشن شاہانہ کے سامان میں فصل بہار کی شان دکھاتا تھا اور سلطنت کا نوروز مناتا تھا چوں کہ وہ ہندستان میں تھا اور ہندوؤں میں اُسے رہنا سہنا اور گزارہ کرنا تھا اس لئے اُن کی ریت رسوم کی بھی بہت سی باتیں داخل کرلی تھیں تمھیں یاد ہے؟ اس بے علم بادشاہ کو علمائے زرپرست نے ذہن نشین کرادیا تھا کہ سنہ ہزار میں ملک وملت بدل جائے گا اور اُس کے صاحب فرمان آپ ہی ہوں گے۔ وہ اس خوشی میں ایسا بے قرار ہوا کہ جو باتیں سنہ الف پر کرنی تھیں پہلے ہی کر گزرا۔ یہاں تک کہ ۹۹۰ھ میں ہی سنہ الف کا سکہ لگا دیا اور جشن نوروزی کے شان وشکوہ میں بھی عمدہ عمدہ ترقیاں اور فائدہ مند اصلاحوں سے جاہ وجلال کو جلوہ دیا جشن کے قواعد آئین نے سال بسال کی ترقیوں سے پرورش پائی مگر آزاد سب کو ایک جگہ سجاتا ہے کہ دلچسپ تماشا ہے۔

دیوان عام وخاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالی شان تھے جن کی عمارات کو خوشنما بیش بہا پتھروں نے سنگین اور رنگین کیا تھا ایک ایک ایوان ایک ایک امیر باتدبیر کو عنایت ہوا کہ ہر عالی حوصلہ اُسے آراستہ کرکے اپنی قابلیت اور علو ہمت کا نمونہ دکھائے۔ ایک طرف دولت خانہ خاص تھا وہ خدمتگاران خاص کی سپرد ہوا کہ آئیں بندی کریں سبھا منڈل کہ جلوہ گاہ خاص تھا سجایا گیا اور تمام مکانات کے در و دیوار کو پرتگالی بانات رومی وکاشانی مخمل۔ بنارسی زربفت وکمخواب، سیلے، دوپٹے، تاش، تمامی گوٹے پٹے، پیمک مقیش کے خلعت پہنائے۔ کشمیر کی شالیں اڑھائیں ایران وترکستان کی قالین پا انداز میں بچھائیں ملکِ فرنگ اور چین وماچین کے زنگارنگ پردے

نادر تصویریں عجیب و غریب آئینے سجائے شیشے اور بلور کے کنول۔ مردنگ قندیلیں۔ جھاڑ۔ فانوسیں۔ قمقمے لٹکائے شامیانے تانے آسمانی خیمے بلند کئے۔ مکانات کے صحنوں میں بہار نے آکر گلکاری کی اور کشمیر کے گلزاروں کو تراش کر فتحپور اور آگرہ میں رکھ دیا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھنا جو اُس وقت ہوا اُس سے بہت کم ہے جو آزاد لکھتا ہے جب عالم ہی اور تھا وہ اصل حال تھا آج خواب و خیال ہے وہ سامان جمع تھے کہ عقل دیکھتی تھی اور حیران تھی۔

اگلے وقتوں کے امرا کو بھی ہر قسم کی عجیب و غریب اور نادر الوجود چیزوں کا شوق ہوتا تھا اور جس قدر یہ سامان زیادہ ہوتا تھا اس سے ان کے سلیقے اور ہمت و حوصلے کا انداز کیا جاتا تھا اگرچہ یہ اوصاف عموماً امیری کے لازمے تھے مگر قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو بمقتضائے طبیعت خاص خاص قسم کی چیزوں کا یا مختلف صنائع و بدائع میں سے ایک دو کا دلی شوق ہوتا تھا۔ بلکہ بعضوں کے عہدے اور منصب اشیا خاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ خان خانان اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل نمایش گاہ بنے ہوئے تھے جن کے در و دیوار فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا۔ اکثر امرا نے اسلحہ حرب کے عمدہ نمونے دکھائے تھے کہ ہندوستان سے جمع کئے تھے اور ملکوں سے منگائے تھے شاہ فتح اللہ نے اپنے ایوان میں علوم و فنون کا طلسم باندھ کر ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی گھڑیاں اور گھنٹے چل رہے تھے علم ہیئت کے آلات۔ کرے۔ اصطرلاب نظام فلکی کے نقشے اور اُن کی مجسم مورتوں میں سیارے اور افلاک چکر مار رہے تھے۔ جر اثقال کی کلیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ علم کیمیا اور علم نیرنجات کے شعبدے ساعت ساعت رنگ بدل رہے تھے۔

۱۳- کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا۔ کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا۔ اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوے کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پیر کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اُس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر وقت لگے رہنا گویا اُن کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قوی کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے لیکن اگر انسان اُن عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قوی کو بے کار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔

انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اُس کے دلی قوے کی تحریک سُست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قوی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بے کار نہ چھوڑے۔ ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی

آمدنی اُس کے اخراجات کے مناسب ہو اور اُس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت
ومشقت کرنی نہ پڑے جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال
تھا اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اس
کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور فریدار
کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اس
کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ بدسلیقہ وحشی ہوتے
ہیں اور یہ ایک وضعدار وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور حقے کے
کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے پس حیوان اور ناریل اور حقے کے فرق سے کچھ
مشابہت میں جوان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان
میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں اُن کے قوائے دلی اور قوت
عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً
انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ
اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اُس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب
ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے
یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا
موقع نہیں رہا ہے اور اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے
دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع
نہیں ہے تو ہم کو اُسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو اگر اس کے
حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ قصور کیونکر
رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیئے کسی نہ کسی بات کی فکر اور
مستعدی رہے اور جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹیگا“

اُس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے ۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

۱۴۔ خطوط

(۱) مولوی نذیر احمد مرحوم

(۱) مجھ کو ہر چند کوئی خاص ضرورت تم کو خط لکھنے کی اس وقت نہیں ہے مگر مولوی صاحب نے پرچہ مانگا اس واسطے یہ چند سطریں لکھ دیں ۔ امتحان سالانہ بہت قریب ہے اپنی جُل ہمت[1] اور تمام توجہ حفظِ کتب میں مصروف رکھو ۔ اگر سال آئندہ میں تم نے سکنڈ کلاس میں ترقی نہ کی تو مجھ کو سخت افسوس ہوگا ۔ ہر چند تم مجھ سے زیادہ مواقع اس بات کے تجویز کرنے کے رکھتے ہو کہ کامیابی کے لئے کون سی تدبیر عمدہ ہے لیکن زبان دانی بے تسوید یعنی کمپوزیشن کے نہیں آتی اور اس خصوص میں تم نے میرے نزدیک غفلت کی اور کرتے ہو ۔ وقت کے انتظام کے ساتھ صرف کرنے میں عجیب برکت ہے تھوڑا تھوڑا روز حاصل کرتے کرتے ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے ۔ مدارس کی تعلیم میں اگر پسندیدگی ہے تو یہی کہ مختلف علوم اور متعدد فنون ایک ساتھ سکھاتے ہیں اگر ایک ہی چیز کو آدمی دن بھر رٹا کرے تو طبیعت اکتا جاتی ہے لیکن کئی چیزیں پیش نظر ہوں اور باری باری سے دیکھے تو سارا دن پڑھتا رہے اور مطلق جی نہ گھبرائے ۔ میں ایسا انتظام کر سکتا ہوں کہ اگر انگریزی کمپوزیشن بھیج دیا کرو تو پادری صاحب سے اصلاح لے کر واپس کر دیا کروں یا اس صورت میں مناسب ہوگا جب کہ تم کو اصلاح دہندہ وہاں میسر نہ ہو ۔ عربی میں مولوی صاحب

---

[1] ساری ہمت

تم کو بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں بشرطیکہ اخذ و[1] اعطا کی شرطیں طرفین سے ادا ہوں۔ فقط

۲۷۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء

(۲) تمھارے خط نے جو بعد اصلاح ملفوف ہے مجھ کو سخت رنج پہونچایا۔ میں نے تم کو انگریزی کی طمع سے جدا کیا۔ سو میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی اور عربی دونوں جایا چاہتی ہیں۔ عربی تو یقیناً جا چکی یہی انگریزی سو میں پاتا ہوں کہ ایسی گروہ غلطیاں تمھاری چٹھی میں ہیں کہ منزل استعداد اُن سے ظاہر ہے۔ تمھاری انگریزی اب ایسی ہونی چاہیے کہ میں اُس میں کوئی غلطی گرفت نہ کرسکوں اس واسطے کہ میں انگریزی داں نہیں ہوں نہ مجھ کو انگریزی کا شوق نہ خدا کے فضل سے انگریزی کی ضرورت لیکن جب ایسی فاش غلطیاں دیکھوں تو کیوں کر صبر کروں۔ تمھارا یہی حال رہا تو میری برسوں کی محنت دھلی میں ضائع کردو گے میں نے تم سے بار بار کہا کہ خطوط کی اصلاح ضرور ہے کسی کو دکھا لیا کرو اور جو اصلاح دے اُس کو خیال میں رکھو تم نے ایسی خودرائی اختیار کی ہے کہ تم کو میرے کہنے کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ اگر یہی انگریزی ہے جو تمنے لکھی ہے تو لعنت بر ہیچ۔ میں نے صرف موٹی موٹی غلطیاں گرفت کیں اگر عبارت کی عمدگی اور محاورات پر نظر کرتا تو ایک حرف باقی نہ رہتا۔ بے شک تمھارے ایسے خطوط سے مجھ کو اندازہ ملا کرے گا کہ تم کیا کرتے ہو۔ تم کو دہلی میں منطقی نہیں ملتے تو کیا اب اتنے بڑے شہر میں کوئی اتنا نہیں کہ تم کو انگریزی میں اصلاح دیدیا کرے مگر تم سمجھتے ہو کہ دہلی اعظم گڑھ ہے۔ تمھارا باپ ہاں کا بھی حاکم ہے۔ اگر تمھارا یہی حال ہے تو دھلی میں رہنا تمھارے حق میں زبوں ہے۔ میں اس کالج سے باز آیا بلا سے انگریزی میرے یہاں عمدہ نہیں۔ عربی تو ہے خط اصلاحی کو حسب عادت عجلت سے مت پڑھو بلکہ بغور۔

آج مجھ سے پھر کوئی منوہر کا تذکرہ کرتا تھا۔ مشن اسکول اعظم گڈھ سے شاید کلھم دو لڑکے امتحان انٹرنس دینے گئے تھے لٹریچر میں بہت اچھے تھے اس واسطے کہ پادری صاحب نے

---

[1] لین دین یعنی پڑھنا پڑھانا۔

لٹریچر پیزدر دیا تھا مگر سائنس یعنی علوم ریاضی ہندوستانی ماسٹروں کے سپرد تھی ... منوہر وغیرہ بُرے نکلے اور ناکام رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ انسان کی طبیعت خاص فن سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن امتحان پاس کرنے کے لئے ضرور ہے کہ جس قدر چیزیں مشروط ہیں سب میں جواب شافی دیا جاوے۔

بشیر! تم ابھی سے ہر چیز پر توجہ رکھو اگرچہ کوئی خاص چیز خلاف طبیعت ہو لیکن امتحان کی ضرورت سے چار و ناچار سب چیزوں کو دیکھنا چاہئے۔ اس واسطے کہ جب مجموعی نمبروں کا ایک حد معین تک پہنچتا ہے تب آدمی پاس ہوتا ہے۔ ۱۰ فروری ۱۸۸۴ء

۲۔ غالب مرحوم

۱۔ خاں صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالب دردمند کا سلام خوب یاد رکھیئے کہ میں نے کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی اب ایک طرح کی عنایت کا سائل ہوں۔ حامل ہذا المکتوب پنڈت جے نرائن میاں یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے بزرگ نواب احمد بخش کی سرکار میں مناصب عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے۔ اب وقت یہ آیا ہے کہ جستجوئے نوکری میں پٹیالے آتے ہیں۔ آپ کو میرے سر کی قسم جہاں تک ہو سکے سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی منصب عمدہ دلوا دوگے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھے نوکر رکھوا دیا ہے۔ بڑا احسان مند ہونگا۔ نجات کا طالب غالب ۱۳ شوال ۱۲۸۱ھ

۲۔ مخدوم و مکرم و معظم مولوی عبد الجلیل صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغ سلام مسنون الاسلام کے بعد عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کی ارادت میرا ذریعۂ فخر و سعادت ہے۔ دو نامے آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے پہلے خط کے حاشیہ اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور میں عینک کا محتاج نہیں ہوں

بااین ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلّف کرنا پڑتا ہے علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو بھی معلوم ہو جاوے کہ اس میں اصلاح کہاں دی جائے واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے اس میں بین المصرعین فاصلہ زیادہ چھوڑیے آپ کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے حروف اُس کے روشن ہیں مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنجِ کتابت اُٹھاتا ہوں اور ان دونوں غزلوں کو بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا اس سے مقابلہ کر کے معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔ مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعِ طرحی کو کیا لکھیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں، کیا معلوم ہے اب کی ہو اور اب کی ہو تو آئندہ نہو۔ والسلام مع الاکرام۔

۳۔ اقبال نشان مرزا علاء الدین خاں بہادر کو غالبِ گوشہ نشیں کی دعا پہنچے برخوردار علی حسین خاں آیا مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اُس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے الولد سر لابیہ تم اس کے مصداق کیوں بنے خفقان و مراق اگرچہ تمہارا خانہ زاد موروثی ہے لیکن آج تک تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا اب کیوں آیا اگر آیا تو ہرگز اُس کو ٹھہرنے نہ دو۔ ہانک دو خبردار اس کو اپنے پاس نہ آنے دینا شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب سبیل ڈاک یہاں آئے مجھ سے اور میرے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے اُن کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے گویا بجائے خود قران السعدین ہیں تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت ۵۰ مان لئے تھے اب اُن سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت سہواً اختیار یعنی قبول کی یعنی ۳ فی جلد اس صورت میں دس مجلد کے ۳۲ میں دوں اور ۲۲ تم دو گے ۶۵ مطبع اودھ

اخبار میں پہنچانے چاہئیں یہیں دسمبر ماہ سال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا کہو
بیبے علی حسین خاں کو دیدوں کہو لکھنو بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد لکھو۔ بانی جب
کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور اتنا دمیر خاں کے میری طرف سے قدم لینا۔ نجات کا طالب
غالب پنجشنبہ ۱۲ جمادی الثانی سال ۷۷ مطابق ۳ دسمبر سال ۶۰۔ کیا غضب ہے ہے۔ یہ گویا
تاریخ وفات نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔

(۳) مولوی غلام غوث مرحوم

اے ملت عاشق ز ملتہا جداست سنیے حکیم صاحب نیرہ شرب الکرام ... نیوت
نہ بلائے تو سارے معاملات میں ارباب زمانہ کے مشرب سے جدا ہے ... اگر کسی کو
کچھ پہنچا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی امانت میرے پاس تھی میں نے پہنچا دی اور بہت خدا کا
شکر کرتا ہوں کہ اس نے آپ دیا اور میرے ہاتھوں سے دلوا کے مفت میں مجھے نیک نام کیا اگر کسی اور کے
ذریعہ سے دلواتا اور یہ نیک نامی اس کے حصے میں جاتی تو میرا کیا زور تھا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

روزیِ خود میخورد ہر کہ دریں عالم ہست — واسطہ شو خوش نماست مفت کرم داشتن

اور یہ ہرگز نہیں تصور کرتا میں نے احسان کیا۔ احسان کا تو جب خیال کروں جب میں اپنے پاس سے
کچھ دوں اپنے پاس سے جب دوں جب کوئی چیز میرے ملک میں ہو میں دنیا کی کسی شے کو اپنی نہیں جانتا
اور کیوں کر جانوں کوئی چیز میری ہوتی تو عدم سے آتے وقت ساتھ لایا ہوتا دنیا سے جاتے وقت
ساتھ لیتا جاتا نہ وہ ہوا نہ یہ ہوگا پھر یہ ملک کیسی اور میں مالک کیسا کچھ نہیں جو
یہاں کی چیزوں کو اپنا جانتے ہیں بڑی غلطی میں پڑے ہیں حقیقت یہ ہے کہ چند روز جو اس عالم کی
سیر کی اجازت ہوئی ہے رفع ضرورت کیلئے کچھ چیزیں بھی عاریت دیدی گئی ہیں۔ مالک کو منظور ہے
جب جو چاہے اس میں سے دوسرے کو دلوا دے ہمیں اس میں کیا دخل ؎

در حقیقت ہمہ زملک خداست　　　　چند روزے بہ عاریت باماست

اس سرائے کو گھر سمجھیں یہاں کی مستعار چیزوں کو ملک قرار دیں اسی بے اختیاری کو جو اس کے دینے میں ہے اختیار تصور کریں پھر اس کا احسان رکھیں لاحول ولاقوۃ ع برین عقل و دانش بباید گریست دعا کیجئے کہ خدا انجام کار تک فقیر کی سمجھ کو ایسی ہی رکھے اور نفس کے دھوکے سے بچائے۔

۲۔ حضرت جس حادثہ کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا تھا وہ آخر بر روآیا جس غم کے اندیشے سے دل بیٹھے ہی جاتا تھا اس کا پہاڑ قضا نے سر پر گرا یا جب آپ کے رنج کا دھیان کرتا ہوں پانی پانی ہو کر آنکھوں سے بہ جاتا ہے کیا گزارش کروں طبیعت کی کیا کیفیت ہوتی ہے جب اس کا خیال آتا ہے کہ کیسی محنت آپ کی خاک میں ملی تقدیر نے بعد رنج کے بھی راحت نہ دی جانتا ہوں کہ آپ زندگی سے بیزار ہوں گے دشمنوں کی ایک جان پر سو طرح کے آزار ہوں گے مگر کوئی آپ سے کیا عرض کرے آپ خود اوروں سے زیادہ جانتے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی کی ذات کو دوام نہیں کوئی ہمیشہ یہاں رہے اس لائق یہ مقام نہیں یہاں کی کوئی حالت اس قابل نہیں کہ انسان اس پر توجہ کرے بلکہ یہ ایک ایسی جگہ ہے کہ یہاں کے تماشوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیے اور چند روز جو یہاں رہنے کے معین ہیں انھیں جس طرح پر گزرے گزار دے جب ہمارا خمیر ہی رنج سے ہو راحت کی فکر فضول ہے ماتم کدہ میں آکر رونے کی جگہ ہنسنے کی خواہش کریں سراسر نامقبول ہے جسے ہم جینا کہتے ہیں وہ موت کے انتظار کی ایک مدت ہے اس پر اوروں کے مرنے کا رنج کریں تو کیسی غفلت ہے اور اگر آپ اپنے مشرب کے موافق غور کریں تو وجود اعتباری کے معدوم ہونے سے ہستی حقیقی کو زوال نہیں آتا تبدیل شان اور تبدیل مکان کرنے میں گرہ سے کچھ نہیں جاتا حباب جب ٹوٹ جائے دریا ہے شبنم جب اپنی صورت کو مٹائے تو خورشید ہو کب جدا ہے پھر اس کا غم کیا اور اس کا ماتم کیوں۔ غرض اس طرح سمجھئے یا اس طرح اس کے سوا چارہ نہیں کہ دل کو سمجھائیے اور گریہ و بکا کے بدلے مرحومہ کے ایصال ثواب میں صرف اوقات فرمائیے۔ خداوند تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے اور آپ کو استقلال اور استقامت کی ہمت دے۔

۱۵۔ جلال الدین اکبر بادشاہ

جب ہمایوں جودھپور کی مصیبت بھر کر امر کوٹ میں پہنچا تو اقبال کے پُتلے تارے نے آنکھ کھولی یعنی اکبر پیدا ہوا۔ شاہ بے سپاہ کے نمک حلال رفیقوں نے آکر مبارکبادیں دیں۔ اس کے پاس کوئی رسم ادا کرنے کا سامان نہ تھا چپ ہو گیا لیکن کمر میں ایک مشک کا نافہ یاد آ گیا وہی نکالا اور شگون کے لئے ذرا ذرا سا مشک سب کو بانٹ دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو اس نحوست کے وقت میں کسے خیال ہو گا کہ اس بچے کی شمیم اقبال بوئے مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ چند ہی روز کے بعد قندھار کا سفر پیش آیا اس منزل دُنیا کے تازہ وارد کو باپ کا ساتھ دینا پڑا اگر راہ میں [illegible] تو مرزا [illegible] کے ڈر سے ایران کو بھاگا بیٹے کو گرمی کے سبب سے جاں نثاروں کے حوالے کیا۔ ماں کلیجہ پکڑ کر روتی دھوتی خاوند کے ساتھ چلی گئی پیچھے مرزا عسکری یعنی چچا آیا۔ مال اسباب بھائی کا سمیٹ قندھار کو چلا گیا اور بھتیجے کو کابل [illegible] کے پاس بھیج دیا۔ یہ نونہال اقبال وہاں پرورش پاتا اور ایسی باتیں کرتا کہ دیکھنے والوں کو تعجب آتا۔ [illegible] اس کی [illegible] کئی برس بڑا تھا اور یہ دودھ پیتا تھا۔ ایک دن [illegible] ہمایوں اور بیگم کی یاد میں اور اپنی قید میں [illegible] [illegible] نے [illegible] اور [illegible] کہ اگر اس وقت اس لڑکے [illegible] [illegible] اس [illegible] باپ کا اقبال بھی ضرور چمکا دے گا۔ خدا کی شان اس نے [illegible] [illegible] رہ گئے کہتے ہیں کہ جب ہمایوں [illegible] کابل کا محاصرہ [illegible] [illegible] [illegible] نکال دیا [illegible] حیران ہوئے [illegible]

بوچھار دیکھکر بے رحم چچا نے بھتیجے کو بٹھا دیا ہے۔ جب فتح یاب شہر میں داخل ہوئے تو
بیگمات محلسرا میں جا اتریں۔ اس وقت عجیب لطف ہوا یعنی بادشاہ بیگم بھی انھیں میں
مل کر بیٹھ گئیں۔ اب اکبر سوا چار برس کا تھا۔ اتا انگلی پکڑے لائی اور کہا لو اماں جان کو
پہچانو اور ان کی گود میں جا بیٹھو۔ اکبر نے بیچ میں کھڑے ہوکر سب کو بغور دیکھا اور دوڑ
کر سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ غرض ہونہار بیٹا باپ کے ساتھ کئی برس تک فتوحات
میں اپنے اقبال سے مدد دیتا پھرا۔ جب دلّی میں آئے تو باپ دار الخلافے میں حکمرانی کرتا تھا
اور افغان جو پنجاب کے دامنِ کوہ میں چھپے تھے ان پر دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا
تھا۔ دفعتاً باپ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ بیرم خاں اتالیق تھا چنانچہ اکبر اسے خان بابا کہتا تھا
اور وہی کاروبار کا منتظم تھا اس نے فوراً سرداروں کو جمع کرکے شہزادے کے سر پر
تاج شاہی رکھدیا اور دلّی کی طرف تخت رواں کا رخ کیا۔ راستہ میں خبر لگی کہ ہیمو بقال
نے آگرہ لے کر دلّی کی طرف باگیں اٹھائی ہیں جالندھر کے مقام پر عرضیاں پہنچیں کہ
دلّی کے حاکم نے آگے بڑھکر میدان کیا تھا مگر خود شکست کھا کر پنجاب کو بھاگا اور ہیمو
دلّی میں آگیا۔ اکبر تو لڑکا تھا سنتے ہی چپ ہوگیا۔ مگر تمام سرداروں کی آنکھوں میں
شیر شاہی معرکے پھر گئے اور کہا کہ دشمن ایک لاکھ سوار اور ہزار ہاتھی کی فوج رکھتا
ہے اس کے ساتھ اس حال سے مقابلہ کرنا اپنے خون سے ہاتھ دھونا ہے بہتر یہ ہے
کہ یہیں سے کابل کو پھرو۔ سال آئندہ میں آکر خبر لیں گے۔ اکبر نے بیرم خاں سے علیحدہ
کہا کہ دادا کا نام اور والد کا کام تمھارے دم سے تھا اب تم کہو کہ صلاح کیا ہے۔ اس نے
کہا کہ تمام دربار میرے حاسدوں سے بھرا ہے آپ کی والد کی قدر دانی سے میرا گذارہ تھا
اس معرکے کا سنبھال لینا بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر یہ لوگ میری بات پیش نہ جانے
دینگے۔ اکبر نے ہمایوں کی روح کی قسم دیکر کہا کہ تم کسی کی پرواہ نہ کرو اور بے تامل جو
مناسب دیکھو کرو۔ خان خاناں نے پھر جلسہ میں آکر تقریر کا سلسلہ ہلایا۔ سب نے کہا کہ

بیگانے ملک میں لڑکر لاشے چیل کوؤں کو کھلانے سے کیا حاصل۔ بہتر یہ ہے کہ کابل میں چل کر
بیٹھو اور اُدھر سے لشکر لے کر سال آیندہ اس مہم پر جاؤ۔ بیرم خاں نے کہا کہ جس ملک کو
دو دفعہ لاکھوں جانیں دیکر لیا اب اُسے بے مرے مارے دشمن کے حوالے کرنا مردانگی کا
منہ کالا کرنا ہے۔ بادشاہ تو آج بچہ ہے مگر ہم تم بوڑھے سردار ہیں آقا نے عزتیں بڑھا کر ایران
توران تک ہمارا نام روشن کیا۔ لوگ کیا کہیں گے سفید داڑھیوں پر یہ سیاہی اٹھانی
بڑے حیف کی بات ہے۔ اکبر اُسی چھوٹی سی عمر میں سنبھل کر ہو بیٹھا۔ اور کہا خان بابا میری
رائے تمھارے ساتھ ہے۔ اب کہاں جانا اور کہاں آنا۔ بغیر مارے مرے ہندوستان
نہ چھوڑیں گے یا تخت یا تختہ۔ بچے کے اس کلام سے بڈھوں کی خشک رگوں میں
خونِ مردانگی دوڑ گیا۔ بیرم خاں خانخانان اُسی وقت تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور
کوچ کا حکم ہو گیا۔ رستہ میں اُدھر کے بھاگے ہوئے سردار آکر ملنے شروع ہوئے
خانخاناں نے بہت شرمندہ کیا اور کہا کہ سبحان اللہ آقا کے بعد اُس کے بیٹے کے ساتھ
جواں مرد اسی طرح حق نمک ادا کرتے ہیں غرض کسی کو سزا کسی کو دلاسا دیتے چلے ہیموں
ڈھوسر بھی نام کو بقال تھا مگر ہمت کا پورا اور عقل کا ٹوکرا ہی تھا۔ دلّی لے کر اور بھی قوی ہو گیا
تھا۔ بڑے بڑے افغانوں کو توپخانے دیکر آگے بڑھایا مگر انھوں نے ہراول سے
ہاتھی چھنوا دئے۔ پانی پت کے میدان میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا ہیموں نے
پہلے توپوں کا زنجیرہ باندھا پھر جن کا بڑا گھمنڈ تھا اور کئی بادشاہوں کے گھر بگاڑ کر جمع
کئے تھے اُنھیں دیوارِ فولاد کی طرح قائم کیا۔ ایک ہاتھی پر کہ ڈیل ڈول میں ابر سیاہ اور
رفتار میں بجلی تھا اور اس کا نام ہوائی رکھا تھا خود صندوقی ہودج میں بیٹھ کر قائم ہوا۔
طرفین کے بہادر داد مردانگی کی دینے لگے۔ اسی حالت میں ایک قضا کا تیر ہودج کو توڑ کر
ہیمو کی بھینگی آنکھ میں لگا خون جاری ہوتے ہی تمام فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ہیمو نے آپ تیر
کھینچ رومال سے آنکھ باندھ لی اور ہودج میں کھڑا ہو گیا ادھر اُدھر پھرتا تھا اور سرداروں کو

پکارتا تھا مگر ہاتھی تیروں کی بوچھار سے بھاگا۔ ایک ترک بے خبر بھاگتا ہاتھی دیکھکر دوڑا اور فیلبان پر تیر جوڑا وہ چلایا کہ نہ مارنا مطلب میرے ہی پاس ہے۔ یہ سُن کر خوش ہوگیا تین کوس پیچھے بادشاہ تھے ہاتھی کو گھیر کر وہاں پہنچایا اور باندھ کر سامنے حاضر کیا۔ خانخانان نے اکبر سے کہا کہ پہلی مہم ہے حضور خود شگون فرمائیں [illegible] وہ مشکیں کسے بندھے ہوئے دشمن پر۔ غرض بادشاہ نے تلوار کھنچوا دی [illegible] بیٹھے اکبر [illegible] ایسا مارا کہ اس کا سر پاؤں میں گر کر کابل پہنچا اور بالا [illegible] دہلی میں بھیجدیا کہ اس فتح عظیم کی خبر خاص و عام کو ہو جائے خود دارالخلافے میں آیا اور دوبارہ تخت نشینی کا جشن کر کے اہل مراد کی مرادیں پوری کیں۔ بعد اس کے صوبوں کا بندوبست شروع ہو گئے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ ٹھاکر سردار حاضر دربار ہوئے۔ ہر علم و فن کے صاحب کمال خدمت میں رہنے لگے۔ اکبر اگرچہ خالص ترک [illegible] اور علم سے بے بہرہ تھا مگر اسی وقت سے سب کے ساتھ محبت اور ملنساری کے [illegible] بیٹھتا تو تاریخی داستانیں اور علمی باتیں سُنتا اُٹھتا تو ہاتھی لڑاتا۔ شیر مارتا [illegible] گیریاں کرتا۔ اور ملک بخشتا دکن کی طرف اکثر علاقے فتح کر کے ابراہیم مرزا [illegible] وغیرہ تیموری شاہزادوں کو دے رکھے تھے اور احمد آباد گجرات میں اپنے [illegible] مرزا عزیز کو صوبہ کیا تھا۔

۱۶۔ مصر کی قدیم یادگاریں

آثار قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سواد شہر کے ویرانوں میں اس وقت تک سیکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں

مجھکو اتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے کہ اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا۔ البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور انہیں کے حال لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اہرام۔ یہ وہ قدیم [illegible] ہیں جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اس قدر تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ یونان کی علمی ترقی سے ان کی عمر زیادہ ہے کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار نہایت کثرت سے تھے یعنی [illegible] دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیئے گئے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اطلاق ہوتا ہے صرف تین ہیں جو سب سے بڑا ہے اس کی لمبائی چار سو اسی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دوگنی ہے نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع سات سو چونسٹھ فیٹ ہے۔ مینار کا مکعب آٹھ کروڑ نوّے لاکھ فیٹ ہے اور وزن اڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے جڑ میں تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتھر کی چٹانیں ہیں اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں آٹھ فٹ کی ہیں اس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے اس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے تعجب یہ ہے کہ پتھروں کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا دراز کا معلوم ہونا تو ایک طرف چونہ یا مصالحہ کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر استحکام کا یہ حال ہے کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے۔ ان میناروں کو دیکھکر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جرثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔ کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جرثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے اور اگر اس ایجاد کو زمانہ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو جرثقیل سے بھی بڑھ کر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ ان میناروں میں ایک جو سب سے

چھوٹا ہے کسی قدر خراب ہو گیا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ ۵۹۳ھ میں ملک العزیز (پسر سلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اس کو ڈھانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں ہزاروں لاکھوں روپئے برباد کر دیے گئے لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استکاری خراب ہو یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

اہرام کے قریب ایک بہت بڑا بُت ہے جس کو یہاں کے لوگ ابوالہول کہتے ہیں اس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن ملا ہے جس کی آب اس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہ ہوگا باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور تناسب سے بنائے ہیں کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں۔ عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی؟ اس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب" کیوں کہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں اُس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں۔

۱۷۔ اِکس ریز یا اشعۂ رانجن

اِکس ریز یا اشعۂ رانجن زمانۂ حال کی حیرت انگیز ترین ایجادوں میں ہے ایک قسم کی روشنی ہے جس سے جسم کی اندرونی کیفیت برائے العین معلوم ہو سکتی ہے غالباً بالکل

مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ اس روشنی کے دریافت ہونے سے طبِ جدید
کا سرمایۂ فخر و نازِ فنِ جراحی دس قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے موجد پروفیسر رانجن باشندہ
وزربرگ (جرمنی) نے جب ۲۳ جنوری ۱۸۹۶ء کے اخبار نیچر میں یہ اعلان کیا کہ
میں زندہ انسانوں اور صورتوں کے نظامِ عظمی کی تصویریں لینے میں کامیاب ہو گیا ہوں
تو طبی دنیا میں ہل چل مچ گئی اور عام لوگ بھی دنگ رہ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا
ہونا کچھ بے موقع بھی نہ تھا کیونکہ پروفیسر رانجن کی ایجاد سے انسان کے قبضہ میں ایک
ایسی قوت آ گئی تھی جس سے آگے چل کر بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے بڑے بڑے کام
ظہور میں آنے والے تھے۔ اگرچہ ایک ایسی روشنی کا ایجاد ہونا جو انسانی گوشت اور
ملبوسات کتابوں کی جلدوں اور لکڑی جیسی ٹھوس چیزوں کے اندر داخل ہو سکے بذاتہ
کچھ کم تعجب خیز بات نہ تھی لیکن علی الخصوص ڈاکٹروں کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔
کیونکہ وہ اب ان چیزوں کو جن کو جسم کے اندر پیشتر بڑی مشکل سے معلوم کر سکتے تھے صاف
دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھکر اس ایجاد کا عجیب ترین حصہ خود روشنی تھی کیونکہ نہ تو
وہ آفتاب کی روشنی تھی نہ معمولی برقی روشنی۔ دنیا کی بہت سی بڑی بڑی ایجادوں کی
طرح اکس ریز کی ایجاد محض اضطراری تھی ایک دن رانجن کروکز کی نلی سے کچھ تجربہ کر رہا
تھا (جو شیشے کی ایک نلی ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر کی ہوا نکال کر بجلی کی قوی رَو اس
میں داخل کی جائے تو اس سے خاص قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے) مگر رانجن کی نلی پر
چاروں طرف سیاہ کاغذ منڈھا ہوا تھا کمرہ میں بالکل اندھیرا تھا یکایک کاغذ روشن ہو گیا
اور اُس کی چمک کم و بیش دو دو گز پہنچنے لگی رانجن اور نیز دوسرے لوگوں کے مسلسل
تجربوں نے جن میں سب سے بڑا حصہ رانجن کا ہے ثابت کر دیا کہ ان شعاعوں کی راہ
میں لکڑی یا اُس قسم کی اور بہت سی چیزیں مطلق حائل نہیں ہوتیں اور شعاعیں ان کی اندر
آسانی سے نفوذ کر جاتی ہیں۔ اور سوائے ہڈی یا لوہے جیسی سخت چیزوں کے ان کا

روکنے والا کوئی نہیں ہے مثلاً اگر ہم اپنے ہاتھ کا فوٹو لیں تو اس سے وہ معمولی شکل پیدا ہوگی
جو ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں لیکن اگر فوٹو اکس ریز کے ذریعہ سے لیا جائے تو گوشت پوست اور
اعصاب و شرائین غائب ہو کر صرف ہڈیوں کے ڈھانچ کی تصویر آجائے گی جراحوں کو
اس سے بہت بڑی سہولت ہو گئی ہے کیونکہ ان شعاعوں کے ذریعہ سے مقام ماؤف کا
پتہ بہت جلد لگ جاتا ہے اور شبہ میں متعدد جگہ عمل جراحی نہیں کرنا پڑتا۔ فرض کیجیے کہ
میدانِ جنگ میں کسی سپاہی کے جسم کے اندر گولیاں رہ گئیں تو اب اشعۂ رانجن کی مدد سے
فوراً دریافت ہو سکتا ہے کہ گولیاں جسم کے کس کس حصّہ میں ہیں ورنہ پیشتر جسم کو چھلنی کی
طرح چھیدے بغیر گولیوں کا نکلنا ممکن نہ تھا خدا اس کے موجد پر رحم کرے اس کے ذریعہ
سے مریضوں کے دُکھ میں کتنی تخفیف ہو گئی جراحوں کے علاوہ ڈاکخانہ اور پولس والے بھی
اس سے مدد لیتے ہیں اس کے ذریعہ سے پارسلوں کے اندر کی چیزیں معلوم کر کے
ممنوع البیع چیزیں روکی جا سکتی ہیں۔ غرض کہ اکس ریز بھی خدا کی دی ہوئی قوتوں کا
عجیب ترین نمونہ ہے۔ اشعۂ رانجن کی وجہ تسمیہ بتانے کی تو غالباً ضرورت نہیں کیوں کہ
صاف ظاہر ہے کہ اس کی نسبت اس کے موجد رانجن کی طرف ہے۔ البتہ اکس ریز کی
ترکیب اُردو خواں پبلک کو بتا دینی ضروری ہے۔ ریز کے معنی تو شعاعوں کے ہیں اور اکس
(X) جو انگریزی حروف تہجی کا ایک حرف ہے رانجن کے نام کا پہلا حرف ہے ... ... [illegible]
کی ترقی میں بہت کچھ حصّہ لیا تھا۔ گویا اکس ریز کے معنی اشعۂ رانجن ہیں۔ اس کا ایک اور
نام لا [illegible] ... امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے دریافت کیا ہے کہ اکس ریز کے ذریعہ سے
کالا رنگ گورا کیا جا سکتا ہے چنانچہ وہ کامیابی کے ساتھ اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہے اور
عنبر فام زنگی کافور رنگ ہو چکے ہیں اگر ان تجربوں میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی تو ... سے
رنگ کا ... [illegible] ... میں ہو جائے گا والغیب عند اللہ۔

۱۸۔ ستارے

اے جگمگاتے تارو! اور جھلملاتے ستارو! اے فلکِ مینائی کی روشن قندیلو! اور فضائے آسمانی کے نظر فریب چراغو! تمھاری جھلملاتی ٹھنڈی روشنی کا مزا وہی آنکھیں خوب جانتی ہیں جو کسی سنسان جنگل یا کسی خاموش اٹاری پر رات کی جھکی ہوئی اندھیری میں تمھارے حیرت انگیز کرشموں کے جلوے دیکھ رہی ہوں۔ تمھاری بھینی بھینی نورانی کیفیت کچھ انھیں نگاہوں کو خوب معلوم ہے جنھوں نے برسات کی کالی کالی گھٹاؤں کے بعد تاروں بھری رات کا سماں دیکھا ہو۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے نیلے نیلے آسمان میں ظاہر فرما کر وہی لطف دکھایا ہے جو سنار ایک خوشنما جگنو میں چھوٹے چھوٹے چمکدار نگینے جڑ کر پیدا کر دیتا ہے تم عروسِ فطرت کی کان کے جھلکتے بندے! تم شاہدِ قدرت کی پیشانی کے چمکتے جھومر ہو۔ تمھاری روشنی آنکھوں میں تازگی دل میں مسرّت دماغ میں فرحت پیدا کرتی ہے۔ لق و دق بیابانوں میں رات کی کمی و بیشی کا پتہ تمھیں سے چلتا ہے۔ سمندر کی طوفانی راتوں میں ملّاحوں کی امیدوں کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تمھارے ہی سہارے جلتا ہے۔ موج خیز طوفانوں میں اگر تم جہازرانوں کے لئے چراغِ ہدایت ہو تو امن کی راتوں میں جہازرانوں کے واسطے مہد صحت نیلے سمندر کی سطح پر جہاں کوسوں تک عالمِ آب نظر آتا ہے تمھارا عکس پانی میں چراغ کا لطف دیتا ہے تمھاری بھینی روشنی جھلملا جھلملا کر ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ بیماروں کے قلب میں اعتدالِ صحت کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں کبھی کبھی تمھارے شرارے منتشر ہو کر شب برات کی پھلجھڑی کا سماں یاد دِلاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں پر تمھارا مختلف اثر پڑتا ہے۔ اور انسان کی بہتری اور بدتری کے اسباب خفیہ میں تمھیں بڑا دخل ہے بعض کہتے ہیں کہ تم بھی ہماری دنیا کی طرح ایک ایک دنیا ہو اور تمھارے لئے بھی ایک ایسی ہی زمین ہے ایک ایسا ہی آسمان ہے۔ تمھارے آسمان میں بھی تارے ہیں اور

تمھاری زمین میں بھی نشیب و فراز ہیں۔ تم میں بھی قومیں بستی ہیں اور دریا جاری ہیں مگر میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم جو اس طرح زمین کی طرف ٹکٹکی باندھے چپکے پڑے ہو آیا تم کو اس دنیا کی دلفریبی اپنی طرف کھینچے لیتی ہے یا اس زمین کی آب و ہوا تمھیں مفید ہے اسے ننھے ننھے چمکیلے ذرّو ہیچ کہنا کیا تم میں بھی یہاں کی طرح اونچے اونچے پہاڑ وسیع سمندر ہیں۔ لق و دق بیابان اور بڑے بڑے شہر آباد ہیں؟ کیا تم میں بھی اسی طرح لوگ کام کاج کرتے ہیں۔؟ تم ہماری باتوں کا کیا جواب دو گے۔ جواب دینے والا جواب دے رہا ہے۔ اُس بے نظیر کاری گر کی کاری گری اور اس بے مثل صانع کی صنعت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ بے شک جس نے یہ دنیا بنائی یہ آسمان بنایا۔ پہاڑ سمندر۔ چاند۔ سورج پیدا کیا وہ ایک کیا ایسی ایسی ہزاروں لاکھوں دنیا بنا سکتا ہے۔ عجب کیا جو وہ بے شمار عالم یہی ستارے ہوں (ع۔ ف بدایونی۔)

۱۹۔ مصیبت میں صبر

مصیبت میں رنج کرنا عبودیت کی شان نہیں۔ رنج مصیبت کو نہ ٹال سکتا ہے اور نہ اس کو ہلکا کر سکتا ہے بلکہ اور مصیبت کو بڑھاتا ہے۔ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پہنچتی ہیں مگر اُن میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً طبیب کہ وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہے کبھی اُس کو کڑوی دوا پلاتا ہے اور کبھی اُس کی فصد لیتا ہے اور کبھی بیمار کے زخم کو شگاف دیتا ہے اور کبھی شاید اُس کے کسی عضو کو کاٹ بھی ڈالتا ہے مگر ایسا کرنے سے کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ طبیب اپنے بیمار کے ساتھ عداوت رکھتا ہے [illegible] جو تکلیفیں ہم کو دنیا میں پہنچتی ہیں وہ بلاشک خدائے مقدس [illegible] سے پہنچتی ہیں۔ ظاہر میں تکلیفیں ہیں اور باطن میں [illegible] ابتدا میں اور انجام میں راحت

اوّل تو اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جو تکلیف پہنچتی ہے حقیقت میں بھی تکلیف ہے یا نہیں۔ مانا کہ جو تکلیف ہم کو پہنچی حقیقت میں تکلیف ہے تو کیا شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے کو منصف اور رحم دل بادشاہ اپنی عزیز رعیت کو تادیب اور تنبیہ یا اصلاح یا کسی دوسری مصلحت سے ایذا نہیں پہنچاتا ہمیشہ ایسی ایذائیں پہنچتی رہتی ہیں نہ فریاد نہ شکایت۔ پس اگر خدا کی طرف سے ایک ایذا پہنچ جائے (جانے دو اس کے بیشمار احسانوں کو اور بھول جاؤ اُس کی نامحصور نعمتوں کو) تو بندہ کیوں منہ پھُلائے۔ کس لئے بڑبڑائے۔ سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو پہنچتا ہے یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص عجز و انکسار کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے اور حقیقت میں مصیبت کے وقت بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ مصیبت نہیں رحمت ہے لیکن خدا کو یاد کرنے اور اُس کی طرف رجوع کرنے کے یہ معنی نہیں کہ شکایت کرو اور اُس سے ناراض ہو بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی رحمت پر پورا بھروسہ اور اعتماد کرکے صمیم قلب سے یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔ بہتر ہوا مناسب ہوا۔ اور یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو درجہ رضا و تسلیم کا ہے اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کو جس کا عقیدہ ضعیف اور جس کا دل کمزور اور جس کی ہمّت کوتاہ اور جس کا ارادہ متزلزل ہے اس درجہ پر پہنچنا دشوار ہے۔ مگر اعلیٰ علیین پر نہیں پہنچ سکتے تو ایک سیڑھی دو سیڑھی جتنا ہو سکے کچھ تو اُچکو یا کسی قدر تو ابھرو کہ اسفل السافلین کفران سے نکلو۔

یوں کہنے کو تو مُنہ سے سبھی کہتے ہیں کہ دُنیا فانی ہے۔ چند روزہ ہے۔ خواب ہے، سراب ہے، سایہ ہے، سحاب ہے، برق بے تاب ہے۔ مگر مصیبت کے وقت بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ زبان ہمارے دل کا سچا ترجمان نہیں، کیا کوئی فانی ایک فانی حالت کیلئے اتنا غل مچاتا اور اس قدر روتا پیٹتا ہے۔ مصیبت پر جو منفعت ہم نے ہمیشہ مترتب ہوتے دیکھی وہ تو یہ ہے کہ مصیبت آدمی کے مستقبل کو اس کی ماضی سے ضرور بہتر کر دیتی ہے یعنی اگر انسان کاہل تھا تو مصیبت کے بعد ضرور چست و چالاک ہو جاتا ہے۔ آرام طلب تھا تو جفاکش

بھولا تھا تو سیانا مُسرف تھا تو کفایت شعار۔ بدپرہیز تھا تو محتاط۔ جلد باز تھا تو دھیما۔ آوارہ تھا تو نیک کردار جس آدمی پر کبھی مصیبت نہیں پڑی نہ اُس کی عقل کا ٹھکانا نہ اُس کی بات کا بھروسہ نہ اُس کا دین درست نہ اُس کے اخلاق شائستہ۔ اس کے علاوہ آدمی کا دستور ہے کہ ایک حالت کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر ساری عمر یکسانی کے ساتھ چلی جائے تو اُس حالت کی عمدگی کا احساس باقی نہیں رہتا بلکہ اُکتا کر خود اُس حالت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایک باورچی نمکین اور میٹھے چاول یعنی بریانی اور مُطنجن وغیرہ پکانے میں کامل اُستاد تھا شہر میں کہیں نہ کہیں شادی یا غمی کی کوئی نہ کوئی تقریب لگی رہتی تھی جس کسی کے یہاں چاولوں کی بحث ہوتی اُسی باورچی سے پکواتا اس کی مزدوری کے علاوہ دستور کے مطابق تہ دیگی کی چوٹی دار رکابی بھی ملتی۔ وہ ایک رکابی ایسی ہوتی تھی کہ اُس کا سارا گھر اُس کو کھا کر اٹل ہو جاتا۔ غرض کہ اُن لوگوں کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ بریانی اور بہتر سے بہتر مُطنجن کھانے کو ملتا تھا۔ پس یہ ایک حالت تھی کہ اگر کسی غریب آدمی کے سامنے جو بریانی مُطنجن کو ترستا ہو بیان کیجئے تو سُننے کے ساتھ ہی رال ٹپک پڑے مگر اُس باورچی اور اُس کے اہل و عیال کا کیا حال تھا کہ منتیں کر کے بریانی مُطنجن کی رکابیاں ہمسایہ کے لوگوں کو دیتے اور اُن سے روٹی چٹنی مانگ کر کھاتے۔

پس ہمنے تندرستی کی قدر بیماری سے جانی۔ وطن کی پردیس سے۔ تونگری کی مفلسی سے آرام کی دکھ سے۔ راحت کی مصیبت سے۔ تو جو شخص حقیقی راحت کا خواہاں ہے ضرور ہے کہ مصیبت کا بھی مزہ چکھے۔ مصیبت زدہ کے لئے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ دوسرے مصیبت زدوں پر نظر کرے مثلاً اگر اُس کو صرف بیوگی کی شکایت ہے تو پائے گی کہ اس جیسی اور اس سے بدتر لاکھوں بیوہ عورتیں اور بھی ہیں شاید یہ ایک مُدت خانہ داری کرنے کے بعد بیوہ ہوئی ہے اور ہزارہا اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جنھوں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی پس بیوگی کے علاوہ لاوالدہ بھی ہیں اور شاید اُن کو روٹی کا بھی کہیں

آسرا نہ ہو پس بیوہ اور لاولد کے علاوہ محتاج بھی لنگڑی ندری بھی اور شاید
دُکھیا بیمار بھی اور شاید اندھی اور لولی اور اپاہج بھی۔ کسی کو اگر کھجلی کی ایذا ہے تو وہ
دیکھے گا اپنے ہی جیسے آدمی کوڑھی اور کوڑھ میں کیڑے اور کیڑوں کے ساتھ زخم اور زخموں
میں سوزش۔ العیاذ باللہ جس کی آنکھ میں ناخنہ ہے کیا اُس کو اس سے تسلی نہیں ہوگی
کہ دوسروں کی آنکھ میں ٹینٹ یا دوسرے کانے بلکہ اندھے بھی ہیں۔ غرض دنیا کا حال
یہی ہے کہ ایک سے ایک بہتر ہے۔ پس کیوں کوئی مغرور ہو۔ اور ایک سے
ایک بدتر ہے تو کس لئے کوئی ناصبور ہو۔

۲۰۔ مخالفت

دشمنی اور عداوت۔ حسد اور رنجش اور ناراضی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں
ہے جو خود اُسی شخص میں کمینہ عادتیں اور رذیل اطوار پیدا کرتا ہے۔ اور بعوض اس کے کہ
وہ اپنے مخالف کو نقصان پہنچائے خود اپنا نقصان کرتا ہے اس انسانی جذبہ کو مخالفت کہتے
ہیں۔ دشمنی اور عداوت کا پیشہ اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن یا
زمین یا خون اس جذبہ کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔ حسد کا منشا صرف وہ
اوصافِ حمیدہ ہوتے ہیں جو محسود میں ہیں اور حاسد اُن کا خواہاں ہے مگر وہ اُس میں
نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے
سے ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو بغیر ان
سببوں کے جوش میں آتا ہے۔ اس کا منشا نہ زر و زمین و زن کی دشمنی ہوتی ہے
اور نہ مخالف کے اوصافِ حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ شخص اپنے مخالف کے
اوصافِ حمیدہ کو اوصافِ حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس
کا باعث ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر اُن دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی

بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخالف کی رائے یا عقل وسمجھ دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔

یہ جذبۂ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر تہذیب اور تربیت یافتہ اور نیک دل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے۔ اور نامہذب اور ناتربیت یافتہ بد ذات میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اُٹھاتا ہے اور دوسرا اُن فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے اور دنیا میں خود اپنے تئیں بدطینت اور کذّاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے۔

دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی صحیح کیوں نہ ہو متفق ہو جاویں پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اُس کو چن لوں۔ اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اُس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور اُن غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دلسوز دوست بتاتا ہے کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اُٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشائستہ آدمی یہ راستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کی حُسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے سخت کلامی۔ درشت گوئی۔ سب وشتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کی عیوب واقعی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ تہمت کے بہتان اُس پر لگاتا ہے۔ اور جھوٹی جھوٹی باتیں اُس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد لعنت اللّٰہ علیٰ الکاذبین بنتا ہے۔ اس راہ چلنے سے اور جھوٹ افترا کرنے سے اور لعنتِ خدا کا مورد بننے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کو بدنام کرنا اور عام لوگوں پر جو

اُس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں ناراضی پیدا کرنا ہوتا ہے مگر درحقیقت اُس کا
یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا اور بعوض اس کے کہ اُس کا مخالف بدنام ہو خود ہی زیادہ رُسوا او
بدنام ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب اس مخالف کی بُرائی جو اُس نے براہ کذب واتہام اُس کی
نسبت منسوب کی ہے مشہور ہوتی ہے تو کوئی اُس کو سچ سمجھتا ہے اور بہت لوگ اُس کی تحقیق کے
درپے ہوتے ہیں اور جب اُس کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بعوض اُس کے مخالف کے خود اُسی کذاب
پر لعنت اور تھو تھو کرتے ہیں اور بقول شخصے کہ دروغ کو فروغ نہیں ہوتا تھوڑے ہی
دنوں میں اُس کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ جھوٹا بدگو خود اُسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے
مخالف کیلئے کھودا تھا۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی
اور راست بازی نیکی اور نیک دلی کو کام میں لادے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح
پانے کا ہے ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رُسوا کرتا ہے۔

۱۲۔ حکمائے یورپ کے اقوال

بیکن

مطالعہ بحث و مباحثہ کرنے یا معلومات بڑھانے یا باتیں بنانے کے لئے نہیں
بلکہ غور کرنے اور فیصلہ کرنے کے لئے پڑھا کرو۔

حقیقتِ اشیاء۔ قولِ ارسطو بہت درست ہے کہ ہر شے کی حقیقت و ماہیت قلیل
مقدار میں خوب نظر آتی ہے۔

تعلیم۔ مطالعہ انسان کو وسیع المعلومات۔ گفتگو مستعد۔ اور لکھنا کامل بناتا ہے۔

فصیح البیانی۔ تمیز و عقلمندی کیساتھ گفتگو کرنی فصیح البیانی سے زیادہ قابلِ قدر ہے

دوستی۔ واقعی دوستی دنیا میں بہت کم ہے خصوصاً ہم رتبہ اشخاص میں۔

امید۔ امید ناشتہ کے لئے عمدہ ہے مگر کھانے کے لئے بُری۔

تنہائی۔ سب سے بڑی تنہائی وہ ہے کہ کوئی حقیقی دوست نہ ہو۔

خوشحالی اور تنگ حالی۔ خوشحالی بھی فکر و بدمزگی سے خالی نہیں اور نہ عسرت و تنگ حالی بالکل عافیت و امید سے مُبّرا ہے۔

جانسن

اچھی زندگی۔ جو شخص اچھی طرح زندگی بسر کرتا ہے اُس کے لئے سب طرح کی زندگی اچھی ہے۔

افراط۔ اِن کی خوش اخلاقی اتنی عام ہے کہ کوئی اُن کے خُلق سے خوش نہیں ہوتا۔

کارلائل

ہنسی۔ لوگوں کے ہنسنے سے ہم کو اُن کے عیب و ہنر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

شر و خیر۔ کوئی شے مفید نہیں جو ساتھ ہی ساتھ مضر بھی نہ ہو۔

اصابت رائے۔ میرا یہ دلی یقین ہے کہ کسی معاملے میں یا کسی شخص پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے اُس کی بُرائیوں سے پہلے اُس کی اچھائیوں پر نظر کرنی چاہیے۔

سودی

دیانت داری۔ دیانت دار آدمی خدا کی بہترین صنعت ہے۔

شکسپیر

ماضی و مستقبل۔ ہماری نگاہیں عموماً ماضی و مستقبل پر رہا کرتی ہیں مگر جو حالات ہمارے ارد گرد گزرتے ہیں ان کو ہم نہیں دیکھتے۔

کام۔ مبارک ہے وہ شخص جسے وہ کام مل گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے کہ اُس کو کسی اور سعادت کی ضرورت نہیں۔

موزیلی

رازِ کامیابی۔ کامیابی کا راز ثباتِ عزم ہے۔

دانش کی ابتدا۔ اس کا احساس کہ تم ناواقف ہو واقفیت وعلم کا پہلا قدم ہے۔

گیٹے

سننا اور سمجھنا۔ آدمی اسی قدر سنتا ہے جتنا کہ سمجھ سکتا ہے۔

نئی زندگی۔ نئی زندگی کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جب کہ انسان اپنی آنکھوں سے اُن چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے جن کو اُس نے معمولی طرح سے پڑھا یا دیکھا تھا۔

کسبِ کمال۔ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی کمال کو پہنچ سکتا ہے اگر وہ اپنی مصروفیت کو اپنی صلاحیت وطاقت کے اندر محدود رکھے۔

رسکن

دل و دماغ۔ دل ارادے کے لیے دماغ تدبیر کے لیے اور ہاتھ عمل کے لیے۔

۲۲۔ طمع

طمع ایک ڈراؤنا دیو ہے جس کے سو ہاتھ ہیں وہ سب ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا ہے لے رہا ہے اکٹھی کر رہا ہے مگر ایک ہاتھ سے کچھ دیتا نہیں۔ طمع ایک ایسی عجیب چیز ہے کہ ساری دنیا میں کوئی شے اُس کے مشابہ سوائے قبر اور موت کے ہو نہیں سکتی۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا کو لوٹتی ہیں اور جس کو لوٹتی ہیں اس کو پھر کچھ نہیں دیتی ہیں۔ ورنہ دنیا کا یہ ہے کہ جو قرض لیتا ہے وہ دیتا بھی ہے۔ ساری دنیا میں لین دین برابر ہی رہتے ہوں گے۔ طمع بھی ایک قبر ہے کہ جس میں طامع کی خواہشہائے نفسانی دفن ہوتی ہیں مگر یہ قبر برخلاف اور قبروں کے لبریز ہونے سے اور زیادہ فراخ ہوتی ہے اور جتنی مدت اس پر گزرتی ہے اُس کی گنجائش کو تازگی ہوتی ہے۔ طمع کے لیئے ایک بڑا عذر بیان کیا جاتا ہے

کہ اس کے سبب سے دولت اس لیئے جمع کی جاتی ہے کہ وہ ضرورتیں رفع کرے مگر جب دولت جمع ہوجاتی ہے تو یہ نہیں دیکھنے میں آیا کہ وہ کوئی ضرورت رفع کرے وہ تو کسی خرچ میں نہیں آتی۔ تھوڑے تھوڑے خرچوں میں خست کرنے سے ذلت اٹھانی پڑتی ہے اگر سو پچاس روپیہ سال خرچ کردیا جائے تو وہ ذلتیں نہ اُٹھائی جائیں بعض آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم زندگی اچھی طرح اس کے سبب سے بسر کریں گے۔ اگر ان کو سو روپیہ سال کی آمدنی ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس میں ہماری ضرورتیں رفع نہیں ہوتیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جتنی جائداد اور آمدنی بڑھتی ہے اتنی ہی ضرورتیں بڑھتی ہیں۔ ہرن زخمی ہوکر بھاگے تو زخم اُس کے سامنے رہتا ہے وہ بھاگنے سے تو نہیں جاتا رہتا جائداد بڑھنے سے اُن کی ضرورتیں نہیں رفع ہوتیں۔ جو شخص دو سو روپیہ میں اپنی زندگی بسر کرسکتا ہے وہ طمع کے سبب سے اپنے تئیں چار سو روپیہ کی آمدنی پیدا کرنے کے لیئے دوسرے کا غلام بناتا ہے۔ حکیم سنیکا کا قول ہے طمع ایسی بھوکی ہے کہ اُس کا پیٹ کسی فیاضی سے نہیں بھرا جا سکتا۔ جن چیزوں کو اپنا غلطی سے ہم کہتے ہیں اُن کے خزانچی ہم ہیں۔ پس خزانچی کو اس بات پر رونا نہیں چاہیئے کہ مالک نے مجھے بہت روپیہ نوکروں کو وظیفہ کے لیئے نہیں دیا بلکہ جو اُس کو دیا گیا ہے اُسی کو اچھی طرح تقسیم کردے تاکہ مالک بھی خوش ہو اور خلق بھی بُرا نہ کہے۔ گڈریہ کو رونا نہیں چاہیئے کہ مالکوں نے اُسے بہت بھیڑیں چرانے کے واسطے نہیں دیں۔

طمع ایسی بُرائی نہیں ہے جیسی کہ وہ افسوس کے قابل دیوانگی ہے اور جب اس کا علاج نہ ہوسکے تو پوری دیوانگی ہے جن دواؤں سے دیوانہ کتّے کا علاج ہوسکتا ہے اُنھیں سے طامع کا علاج ہوسکتا ہے سوائے اس کے کوئی علاج نہیں ہے براہین روشن حکمت۔ فلسفہ۔ عقل مذہب کچھ اس پر اثر نہیں کرتے۔ وہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ کی محبت کے واسطے ہی پیدا ہوا ہے کوئی چیز اُس کو روپیہ کی برابر عزیز نہیں ہوتی اس

ابتدا عمر سے یہ شوق دامنگیر ہوتا ہے اور اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ متوسط عمر
میں وہ بہت بڑھ جاتا ہے اور بڑھاپے میں تو ساری خواہشیں اس کی اس میں محو
ہو جاتی ہیں خواہ عقل و فہم کیسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوں۔ خواہ ہنرمندی کی کیسی ہی اوّل
درجہ کی لیاقتیں ہوں خواہ کتنا ہی بڑا خزانہ قبضہ میں ہو مگر یہ سب طمع کے مقابل میں ہیچ
ہیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ طامع یہ نہیں سمجھتا کہ طمع سے باز رہنے سے میری جائداد
کی ترقی ہوگی۔ سقراط کا قول ہے کہ طامع لالچی آدمی کی دولت کا حال آفتاب کا سا
ہے کہ غروب ہو کر کسی کو خوش نہیں کرتا۔ سینیکا کا قول ہے کہ تم مطالعۂ علم اس لئے کرو کہ
دل و دماغ کو عمدہ خیالات سے معمور کرو نہ اس طمع سے کہ تھیلیوں کو روپیوں سے بھرو
سونا چاندی سب خاک آلودہ تھے طمع نے یا عالی ہمتی نے ان کو پاک صاف کیا ہے۔
سونے کی طمع ملعون اور مضر ہے ایماندار کب چاہتے ہیں کہ طمع کر کے بے ایمانی سے
دولت کو پائیں۔ طامع دولت کو اپنی اولاد سمجھتا ہے۔ اسی کو قانون اور عدالت جانتا
ہے۔ طمع کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ ہمیشہ بھوکی رہتی ہے طامع کا مقدور خواہ کتنا ہی زیادہ
ہو جائے وہ روپیہ پیسے کی قدر کو کم نہیں کرتا۔ جو اس کی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کی حالت
میں روپیہ کی قدر تھی وہی ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی میں۔

حریص طامع ہمیشہ مفلس اپنی بے وقوفی کے سبب سے رہتا ہے۔ مفلس کو بہت چیزوں
کی احتیاج ہوتی ہے طامع کو کل چیزوں کی مگر سچ یہ ہے کہ مفلس کو تھوڑی چیزوں کی ضرورت
ہے اور آسودہ حال کو بہت چیزوں کی۔ اور طامع کو کل چیزوں کی۔ طمع کی شہوت نے
کل انسانوں کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا قبضہ انسان پر ہے نہ
کہ انسان کا قبضہ دولت پر ہے طمع اکثر اُن آدمیوں کو ہوتی ہے جن میں نیکیاں قابلِ
تعریف نہیں ہوتیں طمع ایسی گھاس ہے جو بنجر زمین میں اُگتی ہے۔

۲۳۔ شنقار ملکِ معظم ایڈورڈ ہفتم

منہ اُٹھا کر یہ کہہ دیا کہ شاہنشاہ برطانیہ اعظم قیصر ہند کا انتقال ہو گیا بڑی غلطی اور کم فہمی ہے کیوں کہ اس سلطنت کا بادشاہ تو کبھی مرا ہے نہ مرے گا۔ کسی کام کسی انتظام میں فرق آئے یا قدیم بادشاہوں کی طرح بادشاہ کے مرتے ہی تمام کاروبار بند ہو کر حقداروں کی باہمی جنگ وجدل اور رہا ہی ٹھن جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت وہ بادشاہ اب نہیں رہا جس کے زیر سایہ ہم اس وقت تک امن وامان سے دیکھ رہے تھے۔ انگلستان کی سلطنت ایک خدائی سلطنت ہے جس میں ایک بادشاہ کا تخت سے کنارہ کش ہونا دوسرے کا قدم مبارک اُس پر رکھا جانا غیریت اور مخالفت ثابت ہی نہیں کرتا۔

مشرقی بادشاہوں میں دستور تھا کہ بادشاہ کے مرنے کو اس طرح چھپاتے تھے جس طرح کوئی بڑے بھاری راز کو چھپاتا ہے۔ جب کوئی بادشاہ بلحاظ قوت وسطوت خواہ بہ خیال حقوق سلطنت تجویز ہو جاتا اور تمام امرا و وزرائے سلطنت متفق الرائے ہو جاتے تو اس وقت ظاہر کیا جاتا کہ بادشاہِ وقت کا انتقال ہو گیا اور فلاں بادشاہ رونق افروزِ تختِ سلطنت ہوا۔ اب اس گئے گزرے شاہانِ مغلیہ کے خاندان کے وظیفہ خوار بادشاہوں میں بھی یہ طریقہ مروج تھا کہ بادشاہ کے مرنے کی خبر مشتہر نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کہہ دیتے تھے کہ آج گھی کا کُپّہ لُڑھک گیا۔ چپکے چپکے نہلا دھلا کفنا کر چپ چپاتے قلعہ کے طلائی دروازہ سے اُس کا جنازہ دفن کرنے بھیج دیتے تھے۔ نوبت نقارے اوندھا دیتے اور کڑھائیاں چولھوں سے اُتار دیتے تھے۔ خوشی کی سب رسمیں موقوف ہو جاتی تھیں۔ پھر دوسرے بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کے شادیانے بجنے لگتے تھے۔ سلامی کی توپیں دغتی تھیں۔ اس سے پہلے یہ رواج تھا کہ جنازے کو تخت سے

آگے لاکر رکھ دیتے تھے۔ جو بادشاہ تخت نشیں ہوتا اس کی چھاتی پر پاؤں رکھ کر تخت پر بیٹھتا یا لاش کو ٹھکرا دیتا تھا۔ مگر یہ رسم اکبر بادشاہ کے وقت سے موقوف ہو گئی۔

مغربی طریقہ پر دھوم دھام سے بادشاہ کو ہفتہ عشرہ تک زیارت گاہ خواص وعوام بنانا۔ ہمسر حکومتوں کے بادشاہوں۔ ولیعہدوں۔ ان کے سفیروں یا ان کے شہزادوں کا دُور دُور سے آکر شریک تجہیز وتکفین میں ہونا کبھی ممکن نہ تھا۔ ہر ایک صوبہ۔ ہر ایک حاکم۔ ہر ایک سپہ سالار۔ ہر ایک وزیر۔ ہر ایک شاہزادہ یہی چاہتا تھا کہ اس تخت کو میں ہی دبا بیٹھوں۔

گو اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ایڈورڈ ہفتم نے اس جہان کی سیر سے سیر ہو کر دوسرے جہان کی سیر کا بستر باندھ لیا اور یہاں کے تمام تعلقات کو اپنے فرزند رشید ولیعہد بہادر کو جن میں ادھر اپنی دادی مرحومہ کے اخلاقِ حمیدہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ اُدھر اپنے والدِ بزرگوار کے اوصافِ برگزیدہ ورثہ میں آئے ہوئے ہیں۔ سپرد کر دیا۔ لیکن اس رعایا کے دل جن کے واسطے اخیر دم تک قلم کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا اُن بادشاہوں کے ارمان جن کو اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھا کر امن وامان کا دروازہ کھول دیا تھا اس متبرک قلب اس مقدس صورت اس نائبِ خدا کو اس طرح ڈھونڈھ رہے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے کھوئے ہوئے دل کو ڈھونڈھتا ہے۔ اللہ اللہ کیا حوصلہ تھا سبحان اللہ کیا ہمت تھی کہ دنیا بھر کے امن کے واسطے خود بڑی بڑی سلطنتوں میں قدم رنجہ فرما کر انسانی ہمدردی رحمدلی اور امنِ خلایق کا راستہ صاف کیا جس کی طرف کبھی کوئی بادشاہ اس طرح بذات خود متوجہ نہ ہوا۔ رعایا کے اقتدار بڑھائے۔ حکومت میں شریک الرائے ٹھہرایا۔ ولیعہدی کے زمانہ میں ہندوستان اور دیگر ممالک محروسہ میں خود جا کر تجربہ حاصل کیا اور تخت پر بیٹھتے ہی اپنے جانشیں بادشاہ حال اعلیٰ حضرت، والا شوکت جارج پنجم کو ہندوستان ودیگر ممالک کی سیر و

تجربہ کے واسطے بھیجدیا جو اس وقت حضور ممدوح کو وہی کام دے گا جو ہمارے مقبول خلائق بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کو دیا تھا۔

یہ وہ وقت ہی کہ ادھر غم اور ماتم کا دیو ڈراؤنی صورت دکھا کر شاہی خاندان سے لے کر رعایا کے بچے بچے تک کو زمین پر لٹا رہا ہی کوئی کہتا ہے کہ آج ہمارے باپ کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا۔ کسی کو رونا ہی کہ ہمارے سر کا تاج دلی مونس وہمدم ہم سے یکدم جُدا ہو گیا۔ کوئی اس سایۂ خُدا کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ جس نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہندوستان کی سرزمین کو چار چاند لگائے تھے کوئی حق داروں کا حق سمجھنے والے بادشاہ رحم دل بادشاہ عادل بادشاہ وامن پسند بادشاہ بیکسوں کے حامی بادشاہ علم و ہنر کے ہواخواہ بادشاہ۔ جوہر قابل کے قدردان بادشاہ ترقی دولت وحشمت ملک کو بڑھانے والے بادشاہ کہ کہکر آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہی۔ سچ پوچھو تو یہ سارا رونا اپنے آرام کا رونا ہی جس کی تلافی کی کنجی خود ہمارے آنجہانی ایڈورڈ ہفتم اپنے قدم بقدم چلنے والے زود فہم عقل مجسم جارج پنجم کے سپرد فرما گئے ہیں۔

اِدھر خوشی کی دیوی ہنس ہنس کر جارج پنجم کی تخت نشینی کا مژدہ سُنا رہی ہی اس کا مقولہ ہے کہ مجھی اس حکومت کی بال باندھی باندی ہی۔ اور داد دہی۔ حق رسانی فلاح و صلاح اس کا کوڑیا غلام ہی۔ پانچ برس سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ یہی بادشاہ جم جاہ اپنے دیدار فیض آثار سے تمام ہند کو شرف فرما گیا تھا۔ ادنیٰ ہو خواہ اعلیٰ۔ کسی کو بھی اپنے کریمانہ اخلاق سے محروم نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ اس حقیر ماتم زدہ دلگیر کی تصنیف فرہنگ آصفیہ اور قصیدۂ خیر مقدم کو بھی قبولیت کا درجہ بخشا۔ بھلا جب بادشاہ کی نظر فیض اثر نے ادنیٰ سے ادنیٰ ہوا خواہ کو بھی محروم نہ رکھا اس کا دورِ حکومت کس طرح تمام رعایا و برایا کو مالا مال اور خوشحال نہ رکھے گا۔ رعایا ہند کو جس صدمۂ عظیم نے بٹھا دیا تھا حضور کی تخت نشینی کی خوشی نے از سر نو اس کے دلوں کو کھڑا اور ہرا کر دیا۔

خدائے تعالیٰ ہمارے ایڈورڈ ہفتم کی روحِ پاک کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی شہنشاہ بیگم و لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

۲۴- چشمِ تحقیق

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۵۵۰ سال قبل عظیم الشان ہمالیہ کے زیر سایہ ریاست **کپی لا وست** میں ایک اخترِ تاباں راجہ کے محل میں نمودار ہوا۔ عیش و تنعم کی دیوی نے ہاتھ پھیلا کر اس کو اپنی سنہری آنچل میں لے لیا۔ وہ پھولوں کی سیج پر آرام کرتا سونے چاندی کے کھلونوں سے کھیلتا تھا۔ رقیق القلب ابتدا ہی سے تھا اس لیئے راجہ نے اس کے لیئے مسترت انگیز سوسائٹی موجود کر دی تھی۔ چاند سے چمکنے والے چہرے عنفوانِ شباب کے خون سے بھرے ہوئے دل اُس کی صحبت کی گرم بازاری کیا کرتے تھے کسی کا کیا مقدور جو بودھ (منور) کے سامنے افسردہ دلی سے بات بھی کرے یہی وجہ تھی کہ اخترِ تاباں جو بڑھتے بڑھتے ماہِ شبِ چہار دہم ہو گیا تھا۔ حیات و ممات پیری و نوجوانی کی ماہیت تو دُور رہی نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ دستِ قدرت اپنی کتاب کے جو بعضوں کے نزدیک جانفزا۔ . . . اور بیشتر جانفرسا خیال کی جاتی ہے اوراقِ لیل و نہار اُلٹتا رہا کہ اس عرصہ میں ہمارے ہیرو نے خوابِ طفلی سے بیدار ہو کر باغِ نوجوانی کی سیر شروع کر دی۔ راجہ نے وہ بندشیں جو اُس کے رقیق القلب ہونے کے باعث جکڑ دی تھیں اب ڈھیلی کر دی ہیں۔ بودھ اب بدر ہے اور اُس کے قریب دو ستارے ایک چھوٹا اور ایک بڑا ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ یہ ستارے اس کی بیوی اور خورد سال بچے کے نام سے عوام میں مشہور رہیں۔ بودھ ایک دن ڈانڈی پر سوار شام کے وقت ہوا کھانے چلا جا رہا ہے۔ منظر عجیب و دلکش ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے غروب ہونے والے آفتاب کا ڈر کے مارے زرد ہو جانا گھاٹیوں دروں اور وادیوں میں پیلی پیلی دھوپ کے

مختلف منظر گلہائے رنگا رنگ سے پُر رونق پہاڑ شجر او رحجر کی مختلف الاشکالی قدرت کی اعلیٰ صنّاعی کو ثابت کر رہے ہیں۔ اس وقت پہاڑ لاکھوں پرندوں سے بھرا ہوا ہے جو دامن کوہ سے اپنے آب و دانۂ معمولی کو لے کر اس وقت خالقِ اکبر کی حمد اپنی جنس کی زبان میں گا رہے ہیں۔ اس محفوظ کر دینے والے منظر نے بودھ کے دل کو لبھا لیا اور وہ دل میں خیال کرنے لگا "کاش یہ منظر ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا۔ ہر وقت یہی شام ہوتی یہی پہاڑ ہوتے یہی منظر ہوتا میں اسی جگہ ہوتا۔ غرض جو حالت اس وقت موجود ہے بعینہ وہ ہر وقت مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں لیئے ہوئے ہوتی لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ تو کیا میری آرزو فضول ہے؟ بیشک بیشک انسان کے قبضۂ قدرت سے یہ باہر ہے! افسوس بیچارہ انسان کتنا معذور پیدا کیا گیا ہے"!! بودھ کے دل میں ان خیالات کے ساتھ ہی رنج و افسوس پیدا ہو گیا جس نے سارے لُطف کو کرکرا کر دیا۔ ڈانڈی کا پہیتہ گھوم رہا تھا سورج کی الوداعی کرنیں اُس کے سایہ کو لمبا لمبا کر رہی تھیں آبادی سے دُور ڈانڈی جانے نہ پائی تھی کہ دیکھا کہ ایک اندھا بڈھا جو ضعف کے ہاتھوں جانِ شیریں کو فروخت کرنے کے لیئے بالکل تیار تھا لاٹھی ٹیکتا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ سانس بھٹی کی دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ قدم قدم پر ٹھہر جاتا ہے۔ اس لیئے کہ تازہ دمی کی ضرورت نے مجبور کر دیا ہے آہ اس آخیر وقت میں معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا کئی مصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے۔ یعنی افلاس، پیری، ضعف، موسمی تکلیف وغیرہ وغیرہ نے آپس میں سمجھوتا کر کے اس بیچارے بے کس کی مٹی خراب کرنے کا منصوبہ گانٹھ لیا ہے۔ اس مسئلہ پر کہ مصیبت تنہا نہیں آتی ایک انگریزی شاعر نے خوب کہا ہے "جانور جب بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو مالک اسے نکال دیتا ہے جنگل میں پہنچ کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد دشمنان جانداران کیسی خوفناک چیز ہے۔ موسم کی تکلیف ناطاقتی۔ بھوک اور پیاس کے آگے بیچارہ سرِ تسلیم خم کر کے مُنہ زمین پر ڈال دیتا ہے ایک گدھ جو اس سے بہت بلندی پر اُڑ رہا ہے اس کو بھوکا نیچے اترتا ہے

پھر گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو جاتے اور اس کی انتڑیاں کھینچنے لگتے ہیں" میرے
خیال میں اس حالت میں یہ زیادتی اور ہو جاتی ہے کہ جنگل کے درندے بھی اس بُرے
وقت میں بُرائی میں حصّہ بڑی بُری طرح لیتے ہیں۔ الغرض اس بوڑھے پر بھی مصیبتوں
نے ایکا کر کے حملہ کیا تھا۔ بودھ نے یہ حالت دیکھ کر بوڑھے سے مصائب کی ماہیت سے
آگاہی حاصل کی اور اُسے کچھ نقدی دیکر رخصت کیا۔ بودھ نے معلوم کر لیا کہ کم و بیش
نوعیت میں یہ حالت ایک دن ہر شخص پر طاری ہونے والی ہے۔ اس خیال نے
اسے اور بھی افسردہ خاطر کر دیا۔ جاہ و حشم کی جانب سے وہ بے دل ہو گیا۔ نیرنگی منظر کے
خیال سے جو اُداسی اُس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی وہ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ بودھ کے
کنارہ دل سے سمندر کی موجوں کی طرح بار بار یہ خیال ٹکرا رہا تھا کہ یہ حالت جب پیش آنے والی
ہی تو سارا جاہ و حشم بیکار ہے۔ پھر ہم کیوں اس میں ڈوبے رہیں۔ کیوں اس راہ کو اختیار نہ
کریں جو نزہت گاہِ امن کی جانب جاتی ہے۔ بیوی بچے دوست اور عزیز سب بیکار ہیں
جبکہ وہ ہماری حالت کو نہ بدل سکتے ہیں نہ قائم ہی رکھ سکتے ہیں۔ افسوس یہ سب
لوگ کس کام کے ہیں۔ سلسلۂ خیالات نے بودھ کو یہیں تک پہنچایا تھا کہ اُس کی نظر اُٹھی تو
پڑی جس کو قصبہ کے باشندے لیئے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ بودھ نے اُن لوگوں سے بڑی دیر
تک بات چیت کی جس سے اُسے موت کی نسبت بھی کچھ علم ہوا۔ اب تو بودھ کے خیالات نے
عجیب خوفناک شکل پیدا کر لی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے کو ساتھیوں کے سامنے غیر متاثر
ظاہر کیا حالانکہ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اب ڈانڈی تیسری مرتبہ پھر روانہ ہوئی اور ایک
نوجوان خوش مذاق ساتھی نے ایک دلچسپ کہانی کہنی شروع کر دی۔ بودھ بھی ظاہری طور
سے ہاں ہاں کہتا رہا اسی اثنا میں ڈانڈی ایک بلند مقام پر پہنچ گئی جہاں بڑے بڑے
پتھر صف بستہ تھے۔ بودھ نے یہاں پہنچکر ساتھیوں سے چہل قدمی کرنے کی خواہش ظاہر
کی جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ بودھ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا آخر کار ایک بلند ٹیلہ پر

چڑھ کر جس کے پہلو میں ایک عمیق غار تھا اپنے ساتھیوں سے جو اس سے کسی قدر فاصلہ پہ تھے للکار کر کہا تم لوگ اسی وقت محل چلے جاؤ۔ والدین سے کہدینا کہ "آج کے واقعات نے میرا دل توڑ دیا ہے میں بادشاہت کا خواہشمند نہیں۔ انجام بخیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے مارا مارا پھروں گا۔ جب تک یہ حل نہ ہوگا والدین یا بیوی بچے کو اپنی شکل نہ دکھاؤں گا تم لوگوں نے مجھ سے بے فائدہ بادشاہی کرنے کی امید رکھی میں کسی اور کام کے لیے پیدا کیا گیا ہوں میرے لئے غم نہ کرو۔ خبردار تم میرے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ اس کھڈ میں کود کر اپنی جان ضائع کر دوں گا۔" بودھ کے تمام ساتھی پریشان ہو گئے۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ پتھر پر چڑھ کر شاہزادہ کو گرفتار کر لے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ بودھ جو کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے۔ پس وہ مشورہ کر کے محل کی جانب سب بھاگے تاکہ بادشاہ کو جلد موقع واردات پر لا دیں۔ لیکن راجہ نے جس چٹان پر ساتھیوں نے چھوڑا تھا وہاں بودھ کو نہ پایا۔ دیر تک عالم حسرت میں گریہ و زاری کرتا اور بودھ کے مصاحبوں کو برا بھلا کہتا رہا آخرکار بادل بریاں و چشم پرنم مکان پر واپس آگیا اور سینکڑوں آدمیوں کو اس کی تلاش میں اطراف و جوانب میں چلتا کیا اسی وقت تمام ریاست میں بذریعہ منادی اعلان کیا گیا کہ بودھ کے لانے والے کو اس کے ہموزن چاندی سونا اور جواہرات کا انعام دیا جائے گا۔

دن پر دن اور رات پر رات گزرنے لگے لیکن بودھ کا کہیں پتہ نہ لگا بوڑھے راجہ کی حالت اس واقعہ کے بعد بہت خراب ہو گئی وہ شاذ و نادر ہی دربار کرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس دن سے راجہ کو کسی نے ہنستا نہ دیکھا۔ بہرحال ہم نے تو بودھ کا حال تاریخ ہند کے اس باب میں دیکھا جس کا عنوان "بودھ اور بدھ مذہب کی ترقی ہے" اور معلوم کیا کہ چشم تحقیق بعدہ دل پر کس قدر اثر ڈال سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک عاقل کے لیئے اشارہ کافی ہے۔ لیکن گدھا مار پیٹ سے بھی نہیں درست ہو سکتا۔ دنیا میں جو سانحے ہمیں درپیش آتے ہیں

اُن کو قدرت ہماری تادیب کرنے کے لیئے پیدا کرتی ہے لیکن ہم چند آنسو بہا کر تھوڑی سی گریہ وزاری کرکے اور قسمت پر لعن وطعن کرکے ہر سانحہ کو فراموش کردیتے ہیں۔ حالانکہ قدرت کا یہ منشا ہے کہ اس سانحہ کو یاد رکھ کر عاقبت بالخیر کے لیئے افعال درست کریں اور جو مشکلیں درستیٔ افعال میں پیش آئیں اُن کو عارضی اور فوری خیال کرکے پروا نہ کریں۔

۲۵۔ زبانِ گویا

اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیریں بیاں! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کی پود ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعی جانگداز ہے کہ جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ زبانِ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لُبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا ہے اور کس سے سیکھا ہے! کہیں تیری باتیں مِس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور

کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ ہماری ذلّت۔ ہماری نیک نامی۔ ہماری بدنامی ہمارا جھوٹ ہمارا سچ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام ناصحِ مشفق تیری صنعت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگا اور اس فرض سے جی نہ چُرانا ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھکو یہ اُمید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو عیب بھی کرے اور تہمت بھی لگائے تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لایق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے مُنہ میں اور اوروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گُدّی سے کھینچکر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے اُنھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور مُنہ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غماز غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام۔ پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے! اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بکوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہی تو بے اختیار ہنہناتا ہی اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہی تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہی۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں 'نہیں' اور زبان پر ہاں۔

الٰہی اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھکو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بنکر آئیں۔

۲۶۔ علم و عمل

مصر کے ایک مشہور فاضل کے خیالات

جس طرح جسمانی حیثیت سے بعض انسان کمزور ناتواں اور ضعیف القوٰے ہوتے ہیں بعض تنومند قوی ہیکل اور دیو پیکر اسی طرح روحانی حیثیت سے بھی باہم امتیازِ مراتب ہوتا ہی یعنی کم حوصلہ و کم زور طبع ہوتے ہیں بعض اولوا لعزم و بلند حوصلہ اس اختلاف کا فطری

ثمرہ یہ ہے کہ دونوں کے نتائجِ عمل مختلف ہوتے ہیں۔ کمزور و تنگ حوصلہ انسان کی عادت ہی کہ وہ ہمیشہ بلند رتبہ و صاحبِ اقتدار اشخاص کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اُن کو اپنے سے ایک بالاتر و مافوق الفطرت وجود خیال کر کے سرِ اطاعت خم کر دیتا ہی خود اس کی نقل و حرکت اس کا ارادہ کوئی چیز نہیں رہتا بلکہ اُس کی حالت اس حیوان کی طرح ہو جاتی ہی جو انسانی ہستی کے اقتدار سے ہمیشہ مرعوب اور خوف زدہ رہتا ہی۔

میرے نزدیک جو شخص اپنی قدر و منزلت کا غلط اندازہ کر کے اپنے وجود کو [illegible] آہنگی سے نمایاں کرتا ہے اُس شخص سے زیادہ قابلِ ستایش ہی جو اپنے نفس کو کمزور و ناکارہ خیال کر کے ہر قسم کے عزم و ارادہ سے دست کش ہو جاتا ہے اس لیئے کہ انسان جب خود اپنی نظر میں حقیر ہو جاتا ہے تو اس کے تمام عادات و اطوار میں اس تخیل کا نمایاں اثر محسوس ہوتا ہے علم و فضل آداب و اخلاق عزم و حوصلہ خواہشات وغیرہ بات غرض ہر قسم کی اخلاقی و عملی زندگی میں اس کی ہستی عضوِ معطل نظر آتی ہے لیکن ایک اولوا لعزم و بلند حوصلہ انسان اس کارگاہِ ہستی میں ہر جگہ سرگرمِ سعی و عمل نظر آتا ہے۔

اعلےٰ نصب العین | ایک بلند مرتبہ امام نے ایک دفعہ اپنے شریف النفس بیٹے سے دریافت کیا۔ جانِ پدر! تمھارا منتہائے خیال کیا ہی؟ اور وہ کونسا نصب العین ہی جس کے حصول کے لیئے تم جد و جہد کرنا چاہتے ہو؟ بیٹے نے کہا آپ ہی کی طرح ابا جان میں ہونا چاہتا ہوں باپ نے کہا افسوس تمھاری عقل پر رونا چاہیئے تم نے اپنے نفس کو ذلیل کر دیا اپنی ہمت کو گرا دیا فرزندِ عزیز! میں نے اوائلِ عمر میں یہ عزم کیا تھا کہ میں حضرت علی ابنِ ابی طالب کے سے شرف و منزلت حاصل کروں گا میں متصل اس عزم کے حصول کے لیئے سعی و کوشش کرتا رہا اور آخرکار اس رتبہ پر پہنچا جہاں تم مجھکو دیکھتے ہو لیکن بایں ہمہ میرے اور جناب امیر کے درمیان جو فرقِ مراتب ہی وہ مخفی نہیں پس کیا تم چاہتے ہو کہ میرے اور تمھارے درمیان بھی اس قدر تفاوت ہو۔

امتیاز مراتب | اکثر عوام لوگ تواضع و ذلت نفس کے درمیان فرق نہیں کرتے اور تکبر و خودداری کے امتیاز میں خطا کرتے ہیں اس لیئے دنی الطبع و خوشامدی کو متواضع و منکسر المزاج سمجھتے ہیں اور ایسے شخص کو جو خوددار و بلند حوصلہ ہے۔ عزتِ نفس کا قدر شناس ہے متکبر و مغرور کہتے ہیں۔ درحقیقت تواضع ادب کا نام ہے اور تکبر سوء ادب و گستاخی کا پس جو شخص خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی کے ساتھ تم سے ملاقات کرتا ہے ہمہ تن گوش ہو کر نہایت توجہ سے تمہاری گفتگو سنتا ہے خوشی اور مسرت کے موقع پر تم کو مبارکباد دیتا ہے اور رنج و غم کی حالت میں تسلی بخش کلمات کہکر تمہاری تسکین خاطر کا باعث ہوتا ہے اس کو تم عام لوگوں کی طرح حقیر خیال نہ کرو کیونکہ اس کی فروتنی اس بنا پر نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل سمجھتا ہے بلکہ وہ اس لیئے جھکتا ہے تاکہ اصلی عزت حاصل کرے اس لیئے کہ حقیقی قدر و منزلت صرف حسن اخلاق ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ جب کوئی شریف اور صاحب کمال حد اعتدال سے تجاوز کرکے ذلت نفس پر آمادہ ہو جائے۔ ہر مغرور و سرکش انسان کے سامنے گردن اطاعت خم کردے امرا کی دست بوسی کو باعث عزت خیال کرے اور نا اہل کے قدموں پر اپنا سر جھکا دے عامی و بازاری سے بلا ضرورت دوستانہ راہ و رسم پیدا کرے۔ اپنے نفس کو ذلیل و خوار سمجھے از راہ انکسار اپنے کو جاہل و نا اہل قرار دے اور ایک بزدل فلاکت زدہ شخص کے مانند کوچہ و بازار میں نہایت منکسرانہ طور پر چپ چھپاتا نظر آئے تو یاد رکھو کہ شخص متواضع و منکسر المزاج نہیں ہے بلکہ نہایت تنگ حوصلہ و کمینہ عادات و اطوار کا انسان ہے۔

بے شک بلند ہمتی اور حوصلہ ایک قابل قدر وصف ہے جو موجودہ حیات میں انسانی عروج و ترقی کا زینہ ہے بشرطیکہ اس وصف کے ساتھ غرور و تکبر کی آمیزش نہ ہو جس سے انسان بداخلاقی و فرعونیت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے اقران و امثال سے ہم کلامی باعث عار و ننگ خیال کرتا ہے۔

طلب علم کا حوصلہ | دنیا میں سب سے زیادہ طالب علم کو علو ہمت، و بلند حوصلگی کی ضرورت ہے کیونکہ

ملک وقوم کو اہل حرفہ وکاریگروں سے زیادہ ایک ہادی ورہنما کی ضرورت ہی نیز اس لیئے
کہ صرف علم ہی ہر قسم کی ترقی کا سرچشمہ۔ تہذیب وشائستگی کا عروج۔ نازیبا رسم ورواج
کی اصلاح مذہبی خدمت کا جوش وخروش حب وطن کا ولولہ صنعت وحرفت کی گرمیٔ
بازار سب علم پر موقوف ہی۔ طالب علم ایک بحر زخار ہے جو ہر چشمہ وتالاب کو سیراب کرتا ہے
اور ملک وملت کی خدمت میں ہر قدم پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہی۔

ایک ولولہ انگیز خطاب

اے طالب علم اپنا نصب العین بلند رکھ اور عزم وحوصلے کو رہنما بنا۔ دنیا
کے مشہور ومعروف تاریخی انسانوں کے کارنامے اور ان کی عظمت وجلال کی داستانیں
تجھ کو خوف زدہ ومرعوب نہ بنادیں جیسا کہ ایک بزدل انسان جنگ وجدال کے حالات
وجن وپری کے قصص وحکایات سنکر کانپ اٹھتا ہی ایسا نہ ہو کہ یاس وناامیدی کا عنصر تیرے
عزم بلند وشجاعت پر غالب آجائے اور تجھکو اس عالم دار وگیر میں ایک بیکس وعاجز انسان کی
طرح عالم یاس میں پکار اٹھے۔ آہ میں کیونکر دنیا کا بڑا شخص بن سکتا ہوں! کس طرح ان
بلند پایہ اشخاص کا ہمسر ہو سکتا ہوں جن کا جاہ وجلال دنیا پر چھایا ہوا ہے آہ! میں آسمان
پر نہیں چڑھ سکتا اور کسی طرح ان فلک رتبہ اشخاص کا ہم پایہ نہیں بن سکتا۔ اے طالب علم
اس مرتبہ پر پہنچنے کے لیئے جدوجہد کر جہاں تجھ سے پہلے دنیا کے بڑے آدمی پہنچ چکے ہیں۔
تجھ کو اس زینہ کے حاصل کرنے کے لیئے موجودہ قدوقامت کے علاوہ کسی اور قدوقامت
کی حاجت نہیں ہے؛ اور اس فضا اور آب وہوا کے علاوہ کسی دوسری دنیا کی
ضرورت نہیں جو آفتاب تیرے سر پر چمکتا ہے یہی دنیا کے اولوالعزم انسانوں کے سر پر
چمکتا تھا اسی آسمان کے نیچے قوموں نے عروج حاصل کیا ہے اور اسی زمین پر دنیا کے
وہ تاریخی اشخاص بودوباش رکھتے تھے جن کے سر پر عزت ونیک نامی کا تاج رکھا گیا
تھا ترقی کا دروازہ کسی قوم کے لیئے بند نہیں کیا گیا ہے اور کارخانۂ قدرت میں کسی کے
لیئے بخل نہیں ہے صرف ایک بلند حوصلہ نفس وعلو ہمت کی ضرورت ہے ہاں ضرورت ہے

کہ ہماری اُمید و توقع کا دامن زمین سے زیادہ دراز اور ایک باوقار حکیم کے صدر صافی سے زیادہ کشادہ ہو۔

۲۷۔ گزرا ہوا زمانہ

برس کے اخیر رات کو ایک بڈھا اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اُس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے اپنا لڑکپن اُس کو یاد آتا ہے۔ جبکہ اُس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بہن بھائی اُس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اُس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اُٹھتا تھا "ہائے وقت ہائے وقت ہائے گزرے ہوئے زمانے افسوس کہ میں نے تجھ کو بہت دیر میں یاد کیا" پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ۔ سڈول ڈیل۔ بھرا بھرا بدن۔ رسیلی آنکھیں۔ موتی کی لڑی سے دانت اُمنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی۔ اُس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور

نیکی اور خدا پرستی کی باتیں بتاتے تھے اور وہ یہ کہتا تھا کہ "اُہ ابھی تو بہت وقت ہے" اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اِس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لیئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہکر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے"

یہ کہکر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اُڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں تب وہ چلا کر بولا "ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات" یہ کہکر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اُس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اُس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اُس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیئے نہ کہتے تھے بھائی بہن دانتوں میں اُنگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"۔

ایسی حالت میں اُس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پر اُن گلی ہڈیوں میں سے

ایسی محبت کا دیکھنا اُس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا اُس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا۔
اور یہ کہکر چلا اُٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا ہائے وقت نکل گیا! اب کیونکر اس کا بدلہ ہو"
وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا اُس کو کھولا اور دیکھا
کہ ہوا کچھ ٹھہری اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اُس کی گھبراہٹ
کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اُسے اَدھیڑ پنا یاد آیا جس میں کہ نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن
نہ وہ دل رہا تھا نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اُس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا
جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نماز پڑھنی
حج کرنا۔ زکوٰۃ دینی۔ بھوکوں کو کھلانا۔ مسجدیں اور کنوئے بنوانا یاد کرکے اپنے دل کو تسلّی
دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی
تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے
ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر
ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئے اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی آواز نہیں
سنتا اور نہ مدد کرتا ہے اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام
فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ
کہکر چلا اُٹھا "ہائے وقت ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔
آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے تارے نکل آئے ہیں اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ
کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو
آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اُس میں ایک خوبصورت دُلہن نظر آئی
اُس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جُوں جُوں وہ اُسے دیکھتا تھا وہ قریب آتی

جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اُس کے حُسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ میں اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس سے پوچھا کہ تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اُس بدوی کی طرح جس نے کہا "واللہ لا آزید ولا انقص" ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیئے کیجاتی ہے وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اُس کی موت اُن سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں تو دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہکر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اُس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیئے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیئے تھے خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھکر آیندہ نیکی کرنے کی کچھ اُمید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار ہو کر چلا اُٹھا۔ ہائے وقت ہائے وقت کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں ہائے میں دس ہزار دینار دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔

اُس کی پیاری ماں اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔اس کو گلے لگاکر اس کی بتی لی۔اُس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوے ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے کیوں تو بیقرار ہے کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔اُٹھ مُنہ ہاتھ دھو کپڑے پہن نوروز کی خوشی منا۔تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا اُس نے سنکر اُس کو جواب دیا کہ بیٹا تو ایسا مت کر جیسا کہ اُس پشیماں بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دُلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سُنکر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پُکارا کہ" او ہو یہی زندگی کا پہلا دن ہے میں کبھی اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اُس دُلہن کو بیاہونگا۔ جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔اوخدا اوخدا تو میری مدد کر۔آمین"

پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنوں اور اے میری قوم کے بچو۔اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اُس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے آمین۔

۲۸۔زبانِ اُردو کی تاریخ

اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار

اس کا وطن ہے۔ تم خیال کروگے کہ شاید اس میراثِ قدیم کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا اور یہیں پھولا پھلا ہوگا لیکن ابھی سراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی نگاہ میں ہمیشہ کھبا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدالِ ہوا نے بلائے جان ہوکر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھڑدوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانایانِ فرنگ کہ ہر بات کا پتہ پتال تک نکالنے والے ہیں انھوں نے زبانوں اور قدیم نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا۔ یہ غالباً جیحون سیحون کے میدانوں سے اٹھ کر اور ہمالے شمالی پہاڑ آلٹ کر اس ملک میں آئے ہوں گے۔ اس زمانہ کے گیت اور پرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر، ہمت کے پورے۔ صورت کے وجیہ۔ رنگ کے گورے ہوں گے اور اس زمانہ کی حیثیت بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمیں گیر ہوئے اس قوم کا نام آریہ تھا اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی[1] پر درفش کاویانی[2] لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لیکر چین کو نگارخانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے

نوٹ [1] کیان ایران کے بادشاہان قدیم کے مشہور خاندان کا نام ہے کیکاؤس۔ کیخسرو وغیرہ اسی خاندان کے بادشاہ تھے۔

نوٹ [2] ضحاک ایران کا ایک ظالم حکمران تھا جس نے ملک پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا جب لوگوں نے اُس کے ظلم سے تنگ آکر اُس کی مخالفت شروع کی تو فریدوں کو جو ایران کے پرانے شاہی خاندان سے تھا اپنا سردار بنایا اور کاوہ نامی لوہار نے وہ چمڑے کا ٹکڑا لے کر جس کو وہ کام کرنے کے وقت کمر سے باندھ لیا کرتا تھا اس سے علم تیار کیا جب فریدوں ضحاک کو شکست دے کر تخت پر بیٹھا تو اُس نے علم کو جواہرات سے مرصع کرایا اُس علم کا نام درفش کاویانی ہے۔

الگ جمایا روما کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اُندلس پہنچکر چاندی نکالی۔ یورپ سے
خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں سے
دھات کھودتے کھودتے لعلِ بے بہا نکال لائے تب اصلی رہنے والے کون تھے اور
اُن کی زبان کیا تھی۔ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبان
کہیں کچھ کچھ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے اور یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے اسی
طرح اِس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس عہد کی باقی زبانیں وہ ہوں گی جن کی
نشانی تامل۔ اوڑیا۔ اور تلیگو وغیرہ اضلاعِ دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود
ہیں بلکہ اس حالت میں بھی اُن کی شاعری اور انشا پردازی کہتی ہے کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوے
کی ہے اور سنسکرت سے انھیں لگاؤ تک نہیں۔

قیتایوں نے ہندوکش کے پہاڑ اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے
پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی
گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے اور وہی شودر کہلائے ہوں گے
چنانچہ ابھی تک اُن کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مدت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے
جلے رہے ہوں گے یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد[1] اور اُسی کے زمانہ
کی تقسیم برہما[2] کے زمانہ سے اور اُس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے اور
چاروں برنوں[3] کا برابر پتہ لگتا ہے یہاں بودھ نے انھیں توڑا وہاں زردشت کے مذہب
نے اُسے جلا کر خاک کیا مگر ہندوؤں نے بودھ کے بعد پھر اپنی حالت کو سنبھال لیا ایرانی
اپنی حالت کو نہ سنبھال سکے۔

چاروں برنوں کی تقسیم اور ان کا الگ تھلگ رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غور

---

[1] پارسیوں کا ایک پیغمبر۔ [2] ہندوؤں کا ایک دیوتا۔ [3] برن فی الحقیقت صحیح لفظ ورن ہے جس کے معنی رنگ کے ہیں۔

کے لباس میں نظر آیا مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بڑی بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں
سلسلے صاف الگ الگ چلے آتے ہیں جو ہندو ہوگا ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص
ہوگا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتہ بتا سکے گا جو دوغلہ ہوگا اُس کا سلسلہ الگ ہو جائے گا۔
اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں تو تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں عجیب الطرفین
آدمی چاہتے تو ڈھونڈھے نہ ملتا۔ فیتجیایوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں
میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست
کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ اٹھ پھر بات چیت رہنے سہنے اور لین دین کرنے
میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی اس واسطے کہا کہ ہماری زبان، زبان
الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے چنانچہ اس کے قواعد و اصول ایسے
اور ایسے جانچکر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ کو
اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا اور سوائے برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک
گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت
اور بزرگوں کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے۔
ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اسی بنیاد پر فیتجیایوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا جس کے معنی
آراستہ پیراستہ۔ صنعتی۔ منزّہ۔ مصفا۔ مقدس جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان
بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر
پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے اس زبان کا نام دیو بانی ہوا یعنی زبان
الٰہی زبان دان وید کے سنہ ترتیب جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے چودہ سو برس
قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں اس وقت ان فیتجیایوں کی باتیں اس ملک اور ملک
والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں۔ اُن کے

سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں گے اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہونگی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو چنانچہ ماگدی دیالی، سورسینی مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی اپنی قدامت کا پتہ بتلاتی ہیں ان کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں مگر بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھا! پراکت کے معنی ہیں طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس۔ ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی کتابی اور دربادی زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص وعام سے پڑتا ہے اس گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں۔ اور ویسے ہی قاعدے صرف ونحو کے بھی ہیں۔ سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منو سمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا اس لیئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتہً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے وہ مگدہ دیس سے اُٹھے تھے اس لیئے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع کیا کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اُس دیس کی زبان تھی اُن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت۔ رسم ورواج دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدہ دیس

کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی- اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اس زبان میں علوم کے کتب خانے بھ گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہوگئے کہیں کہیں کونہ گوشہ میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے وہاں ویدوں کا اثر رہا باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہوگئی- ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوی بڑھے اور باواز بلند کہدیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے اصل میں ان کی بھی اوتاد مطلق بودہ کی زبان بھی یہی ہے- اس کے صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں- خدا کی قدرت دیکھو جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونہ میں بیٹھ گئی-

زمانہ نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بودہ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اُن کے ساتھ اُن کی زبان بھی رخصت ہوئی- شنکر آچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا پھر اُبھر کے چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے- اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی- کیونکہ اس عہد میں جو کالیداس ملک الشعرا نے شکنتلا ناٹک لکھا ہے سبھا میں دیکھو بادشاہ- امرا- اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں- کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کے برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں- اس وقت میں بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی تمام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لیئے باعث برکت تھی کہ دفعتہً زمانہ کی شعبدہ بازی نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں

آیا اُس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اُسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند اوستا[1] کی زبان ایرین کے رشتہ سے ایک دادا کی اولاد ہیں مگر زمانہ کے اتفاق کو دیکھو کہ خدا جانے کئی سو برس یا کئی ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتے۔

ہندوستانی بہن کی کہانی سن چکے اب ایرانی بہن کی بھی داستان سن لو کہ اُس پر وہاں کیا گزری اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گزرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اُس ملک میں جاکر بسی ہوگی اوّل تو مدت تک ان کے مذہب رسم و رواج اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے مگر اس زمانہ کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتہ ملتا ہے تو زرتشت[2] کے وقت سے ملتا ہے جسے آج تخمیناً ۴۲ سو برس ہوئے اس نورانی موحد نے شعلہ و آتش کے پردے میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا[3] اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی وہاں وہی مصیبت ژند اوستا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ

---

[1] پارسیوں کی متبرک کتابیں

[2] آتش پرستوں کے مذہب کا بانی۔

[3] ایران کا بادشاہ جس نے زرتشت کے مذہب کو قبول کرکے اس کی اشاعت کی۔

کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اُتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بُجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کیئے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں جبکہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے بھی زبانوں پر زور دکھایا ہوگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا[۱] والوں کا عمل دخل ہو گیا۔

وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اُتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اُس کے دربار میں سر جھکاتی تھی پانچسو برس تک ظفر یابوں کے قبضہ میں رہا اور ژند کی کتبِ مقدسہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر فنا کی گئیں۔

سنہ ۲۲۶ء میں پھر تنِ بے جان میں سانس آئی اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی اُن بادشاہوں نے ملک و مملکت کے قدامت کے ساتھ بُجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اُٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پُرانے اوراقِ پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ اُنھیں کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد علَمِ اسلام کے آگے قربان ہوئی اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیئے کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پُرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت گجرات وغیرہ وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتبِ مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ اُن کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں جو چار برن ہند دُوں کے ہیں وہی ایران میں تھے۔

---

[۱] خراسان کا پُرانا نام ہے۔

اجرامِ آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیواناتِ بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش آب خاک یا وا برق بجلی گرج ہوا وغیرہ وغیرہ اشیا کے لیئے ایک دیوتا مانا ہوا تھا۔ جس کے اظہار عظمت کے لیئے خاص خاص طریقے۔ یادالٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر بیاں گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یادالٰہی کے گیت ہیں فارسی مروجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	برادر	بھراتر
پور	پُتر	دُختر	دوہتر
مادر	ماتر	انگشت	انگشٹ
زانو	جانو	پا	پاد
بار	بھار	بیم	بھے
بوم	بھوم	خاشاک	کشا
اسپ	اشو	خر	کھر

ایرانی بن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس بعد گزرا اور اُس سے اُس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی کے الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اُس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ ملا جُلا کر گزارہ کر لیتے تھے ادھر سنسکرت

تو دیو بانی یعنی زبان آسمانی تھی اُس میں ملکشوں کو دخل کہاں البتہ برج بھاشا نے اُس بن بُلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم دان ہندو سالہا سال تک ملکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے سخت ہے کیونکہ اپنی گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرتا تھا۔ لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے دو قوموں کے ربط میں ایسا ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں۔

اول تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ اُنھیں انہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔ جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اُس لطف کو جانتے ہیں کہ جب وہ غیر زبان والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی شدّتِ مصروفیت میں اس عالم میں ضروری بات جلدی کہنے کی غرض سے کبھی کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار و محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لیئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا اسی طرح سے اُس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھ لو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح اُن کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو بلکہ لباس دستار رفتار گفتار کو بھی ایسی ہی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں پھر اُن میں

بہت سے قواعد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں اس زمانہ کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اُس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہوتا البتہ جب ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین غوری نے راے پتھورا پر فتح پائی تو چند کوئی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسا لکھا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں بیان کی بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات ولوازمات کا اس ایک لفظ سے سُننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوئی اپنے نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا تو بھی جو صفات اور اُس کے لوازمات نیک یا بد رحم یا عدل زور یا ظلم یہ لفظ اپنی نظم میں دکھا رہا ہے وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا نظیر اس کی آج انگریزی کے سیکڑوں لفظ ہیں اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا مثلاً ایک ہندوستانی شخص اپنے دوست سے کہتا ہے لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہنچیں گے پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے پانچ بجے آنا وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے۔ اب خواہ صحیح ہو خواہ بگڑے مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں کئی کئی سطروں میں ترجمہ کیے جاویں تو بھی حق مطلب بجا نہ لا سکیں گے۔

آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا اتنا ہوا کہ اوّل کایستھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے اور اب اُن لفظوں کو اُن کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے یہ نوبت ہوئی کہ اُدھر بادشاہ اور اُس کے

اعلیٰ درجہ کے اہلِ دربار نے جبہ و دستار کے ساتھ ڈاڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے ادھر ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ نے ایرانی لباس پہنے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے اُس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوگا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوندِ زمین ہوگئے۔ انھیں آپس کے رشتوں معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑی ہوگی۔ تازہ ولایت آدھی اپنی اور آدھی اُن کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہونگے۔ اُن زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں۔ صرف امیر خسرو کی ایک غزل و پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتہ بتلاتے ہیں کہ [illegible] میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ اُن کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عینِ اوج پر تھا شہر اور شہرپناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دارالخلافہ ہوئی بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف۔ اہلِ قلم۔ اہلِ حرفہ۔ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں وہاں کی بولی کا نام اُردو ہوگیا۔ اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کی اُردو کی طرف منسوب و مشہور ہوگئی ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔

بیانات ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبانِ مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مِل جُل جاتی ہے سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے اینٹ۔ چونہ۔ سفیدی۔ وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز چونکہ الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی فارسی ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی بھی شامل ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک وقت ہوگا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان بھی داخل ہو جائے گی۔

بہرحال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعت زبان اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض نہ تھی بجز اس کے کہ امرا و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفرین کے فخر حاصل کریں وہ بھی فقط نظم میں۔ نثر کا حال پوچھی گویا اس طرف توجہ نہیں تھی کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر قدرت کی قدرت دیکھو تھوڑے عرصہ میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم سبب اس کی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چہار درویش کا قصہ لکھا اور نو طرز مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی سنہ ۱۱۹۸/۱۲ ۱۷ع ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔ ادھر جو نجپال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اور

اُمرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا اُس نے دیکھا نظر سے تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے چنانچہ سنہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اُردو اور سنہ ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں آرائش محفل لکھی میر امن دہلوی نے سنہ ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انھیں دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اُردو لکھی سنہ ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں شری للوجی لال کوی نے پریم ساگر لکھی اور بیتال پچیسی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی اب عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ سید انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے سنہ ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں قواعد اُردو لکھ کر ایجاد کی۔ تھنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔ عجیب لطف یہ ہے کہ زبانِ اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا یعنی سنہ ۱۸۰۷ء ۱۲۰۵ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسمٰعیل نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمایش کے لئے اُردو میں لکھے۔

سنہ ۱۸۳۵ء میں دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی سنہ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے ہاتھ سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان بھی یہی دفتری زبان بھی یہی ٹھہری اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹا دیا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انھیں کی زبان میں انگریزی

علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دہلی میں سوسائٹی قائم ہوکر ترجمے ہونے لگے اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہنچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اُس کی وسعت کیا البتہ اُمید کرسکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلہ میں کوئی درجہ پائے۔

۲۹۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہمائے اوج مفاخر و معالی جاگزیں سدرۃ المنتہیٰ[1] مراتب بلند و مدارج عالی و موسّس[2] اساس شیوا بیانی بانیٔ بنائے الفاظ و معانی۔ عندلیب بہارستان سخن گستری طوطی شکرستان معنی پروری اوج سمائے برتری و والاتباری۔ مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری شاگرد رحمٰن استاد سحبان[3] المعی[4] زبان لوذعی[5] بیان فرزدق[6] دہر و لبید[7] اوان سمی[8] وصی رسول اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ خاں غالب تخلص۔ دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش۔ زبان

۱۔ ایک برترین مقام فرشتوں کے اجتماع کا

۲۔ بنیاد ڈالنے والے۔

۳۔ عرب کا ایک نہایت فصیح دبیر۔ امیر معاویہؓ کا میر منشی

۴۔ روشن بیان ذکی۔

۵۔ تیز ہوش

۶۔ عراق کا مشہور شاعر بنی امیہ کے عہد میں

۷۔ ابن ربیعہ مشہور شاعر عرب

۸۔ ہمنام

خلاقِ امور ان کے معنی ایجاد کے زمانہ میں خاموش۔ چراغ انوری انھیں کے شعلۂ فکر
سے روشن اور سینۂ آذر[51] انھیں کی آتشِ حسرت سے گلخن۔ عنصری[52] ان کے رشکِ افکار سے
ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکوّن ہوا تھا اور سحبانی[53] ان کی حسرتِ کمال
سے ایسا رویا کہ گویا اس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زلالی[54] ان کے چشمۂ ہنر کا
تشنہ لب اور ابواسحاق اطعمہ[55] ان کے خوانِ استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس
خسروِ معانی کی کم تر رعیت اور خسرو اس بادشاہِ سخن کے آگے سرگرمِ خدمت۔ ملاحتِ کلام
سعدی ان کے خوانِ فیض کی نمک خوار۔ شیرینیٔ زبانِ حافظ ان کی [illegible] [illegible] سے
روزینہ دار۔ رنگینیٔ معنی سے صفحہ کو گلزار رنگ اور طراحیِ فکر[56] سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ
اسی چمن طرازِ سخن وری اور نقاشِ صحیفۂ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے
گرانی اٹھائے تو کوہ کا حشم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورقِ
بیاضِ صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی طراوش سے فوارۂ نور اور
عبارت پاکیزہ اُن کے لطفِ کیفیت سے شرابِ انگور۔ اگر اس سخن طراز کے کمال
استعداد کو جو طرفِ حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ دوزبان بیان کرے اوّل
چاہیے کہ ملکۂ عقلِ فعال[58] سے عاریت مانگے اور زبانِ قلمِ تقدیر سے مستعار لے

---

۵۱ - مشہور شاعر آذر آگ کو کہتے ہیں

۵۲ - محمود غزنوی کا رئیس الشعراء

۵۳ - مشہور شاعر

۵۴ - شاعر کا نام ہے

۵۵ - ابواسحاق کا لقب ہے

۵۶ - نقاشی

۵۷ - چین کا تصویر خانہ مانی کا بنایا ہوا۔

۵۸ - عقول عشرہ میں دسویں عقل اس کو عقل عاشر بھی کہتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب
میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہر گاہ کہ میں نے اس تقدس جوہر اور امداد مدار فیاض
کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا کارکنان بارگاہ جلال سے کمی استعداد کا طعنہ سنا اور
سوئے ادب کی سرزنش حاصل کی تو باایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے فی الحقیقت
اگر لنگ لنگان نے اپنے تئیں جادۂ[۵۱] مقصود میں ڈال دیا تو ہوس حق السعی یعنی
شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابان
انصاف طینت کے آگے حصول صلۂ آفریں تو کیا خجلت نارسائی طعنۂ ناعاقبت بینی سے
سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی ۔ نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا
عبداللہ بیگ خاں تھا ۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب
تک پہنچتا ہے ۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بہ سبب اس کے کہ اُن کے ہم جنس
و ہم گھر[۵۲] تھے فرماں روائی رکھتے تھے ۔ جب سلجوقیوں[۵۳] کے عہد سلطنت کا دور تمام ہوا
ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر مشفق
سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک
کے رفیق ہوئے اور اُس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار
میں سر رشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا ۔ حضرت کے
والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی پھر کسی سبب سے بود و باش
اکبر آباد میں اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش
عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنت نعیم کے گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے ۔

---

۵۱ ۔ راستہ

۵۲ ۔ ہم وطن

۵۳ ۔ ترکوں کا ایک خاندان جو ازمنۂ وسطیٰ میں شام ایشیائے کوچک اور ایران پر حکمراں تھا ۔

آپ کے چچا حقیقی نصراللہ بیگ خاں کہ اُس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے
صوبہ دار تھے۔ آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے۔ جب ہندوستان میں
تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کے رفیق ہو کر چار سو سوار
کے رسالہ سے اعادی[1] باد پیما[2] کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جنرل لیک صاحب نے
اس کارِ نمایاں کے صلہ میں دو پرگنہ مضافات اکبرآباد سے آپ کی حینِ حیات تک جاگیر
میں عطا کئے پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا اور جاگیر موافق قرارداد
کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہوگئی پھر وہاں
سے بہ سبب اُنسِ طبیعت اور میلِ خاطر کے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور
اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس
عالمِ تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر منت اور
سرِ معنی پر بارِ احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس
ہے۔ ان کی نعمت ترتیب کا راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان
نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے اور چوں کہ دلہا را بدلہا راہ
باشد۔ آں حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف
سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا میں اپنے اعتقاد میں آپ کے ایک حرف کو
بہتر ایک کتاب سے اور آپ کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور
اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال اُن لوگوں کا جو آپ کی خدمت سے مستفید
ہوتے ہیں اور جو گوہر گرانمایہ کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر حرز دانِ
حافظہ میں محفوظ اور صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین
عطائی پر مستفید کے پاس خردہ دار خردہ دار فراہم آگئے ہیں اور چوں کہ مثلِ مبداء فیاض

---

[1] اعدا کی جمع
[2] بیہودہ فضول کوشش کرنے والے۔

کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبتِ بخل سے مبرا ہے آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطا
میں کچھ دریغ نہیں آتے۔

لطفش کہ بدوست جاں توانا   چوں بادہ خرد فزائے دانا

آپ کا جواہر خانہ نفائسِ سخن حدِ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے
ایک دیوان قصائد و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور
اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوائدِ جلیلہ پر مشتمل قریب
چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائجِ فکر سے کہ منتہیانِ معنی رس کے واسطے مغتنمات
عظمیٰ سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی
صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو
کے ہو چکی ہے انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزمِ احباب ہوگی۔

۳۰۔ شاعری

شاعری کی حقیقت | شاعری چوں کہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کی جامع
اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی
حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح
نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا، اور مختلف قوتیں دی ہیں اور اُن میں سے ہر
ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور
ارادات کی سرچشمہ ہیں۔ ادراک اور احساس۔ ادراک کا کام اشیاء کا معلوم کرنا اور
استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات۔ تحقیقات انکشافات

اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر تدبر کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس۔ انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گرجتا ہے مور جھنگھارتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے طاؤس ناچتا ہے۔ سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں [illegible] کر سکتے ہیں کہ جو [illegible] انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لاوے وہ شعر ہے۔

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے" اس بنا پر فلک نیلگوں۔ نجم درخشاں۔ نسیم سحر۔ گلگونۂ شفق۔ تبسم گل۔ خرام صبا۔ نالۂ بلبل۔ ویرانی دشت۔ شادابی چمن۔ غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فرید الدین عطار نے آج سے

چھ سو برس پہلے کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی مصوری صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے موسیقی صرف قوت سامعہ کو محفوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کسی چیز[۵] کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کر کے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہو گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذباتِ انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ لیکن شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے لیکن یہ خاصیت موسیقی تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہیئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں

ف ۵ یہ تمام تقریر حالی صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جُدا جُدا چیزیں ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے اسپیکر حاضرین کے مذاق معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے کہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اُس کے سامنے ہے بھی یا نہیں ؟ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو اُن کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سُنائے لیکن اگر کوئی شخص سُن لے تو ضرور تڑپ جائے گا ۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اُن کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنے کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے تو سارا پارٹ غارت ہو جائے گا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو اُبھارنا چاہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے بخلاف اس کے کہ خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں ان میں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں بندش صاف ہوتی ہے طرزِ ادا میں جدّت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص اُن چیزوں کو متعین کر دینا چاہئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے اس لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ تاہم اُن کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوّری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ شعر خیال کئے جاتے ہیں شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی اس لئے تخئیل بھی محاکات ہی ہے لیکن یہ زبردستی ہے آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخئیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جاوے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست۔ صفائی حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزاء اصلی نہیں بلکہ عوارض مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصوّ

انسان کی ایسی اچھی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج۔ خوشی۔ تفکر۔ حیرت۔ استعجاب۔ پریشانی اور بیتابی ظاہر ہوں۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جارہے ہیں۔ تلووں کو سہلانے وقت گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گوناگوں واقعات حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً قاآنی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے۔

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں می خزد　　　غنچہ ایں مے مکد عارض آں می گزد
سنبل ایں می کشد گردنِ آں می گزد　　　گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد
گاہ بہ شاخ درخت گہ بہ لب جوئبار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی کسی پھول کا گال چوم لیا کسی کی ٹھوڑی چوس لی کسی کے بال کھینچے کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔ کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس سمے کو مصور تصویر میں کیوں کر دکھا سکتا ہے؟

یہ تو مادی اشیا تھیں خیالات جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے تصویر اس سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامہ دولتِ کیقباد　　　ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام و غیر مطابق ہو گی بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں

شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُن کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے باقی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے ضروری نہیں ممکن ہے کہ وہ اُن چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور ایک بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اُس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کر کے نہیں دکھلاتا تاہم اُس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پہ شبنم دیکھ کر وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اُس کو کاملِ فن کا خطاب مل سکتا ہے لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیوں کہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حُسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوتِ تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے لوگوں نے اس کو امعانِ نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اُس کا حُسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخئیل | تخئیل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے۔ وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو

جوہری نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر
کے سامنے کردے" لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم
کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخئیل در اصل قوتِ اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد
صاحبِ تخئیل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے
تو اُس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوتِ تخئیل کی یکساں
ضرورت ہے۔ یہی قوتِ تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور انکشافِ مسائل کا کام دیتی
ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔ چوں کہ اکثر سائنس داں
شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے نامانوس ہوتے ہیں اس لئے
یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوتِ تخئیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح
نہیں بے شبہ عام سائنس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوتِ ایجاد نہیں قوتِ
تخئیل نہیں رکھتے لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں اُن کی قوتِ تخئیل سے
کون انکار کر سکتا ہے۔ نیوٹن[۵۱] اور ارسطو[۵۲] میں اسی قدر زبردست قوتِ تخئیل تھی جس قدر
ہومر اور فردوسی میں البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں
کی قوتِ تخئیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوتِ
تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن
شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذباتِ انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف
اُن موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے شاعر اُن
موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار میں ہُما سیمرغ

۵۱۔ انگلستان کے ایک مشہور حکیم کا نام ہے جس نے کششِ ثقل کا مسئلہ دریافت کیا ہے۔

۵۲۔ یونان کے ایک بہت پرانے اور مشہور حکیم کا نام ہے۔

گاؤزمیں تخت سلیمان کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہی چیزیں ایوانِ شاعری کی نقش ونگار ہیں خلقی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف ثبوت کا مطالبہ ہو گا۔ لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالمِ خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعوے نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیقات کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اُس کی غذا زمین کے کن اجزار سے ہے؟ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں۔ پھول دیکھ کر اس کو بے اختیار یہ خیال پیدا ہوتا ہے ع

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے؟ آباد ہے یا ویران؟ روشن ہے یا تاریک؟ سمندر کے مد و جزر سے اس کو کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا رخ روشن ہے۔ شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیار جاندار چیزیں بن جاتی ہیں اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آئند صدائیں آتی ہیں زمین آسمان ستارے بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے۔

تخئیل کی بے اعتدالی

شعر کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخئیل کا بے جا استعمال کیا جائے طبیعات کے متعلق جس طرح یونانی حکماء کی قومیں بیکار گئیں اور آج ان کے پیرو ہیولے اور صورت کی فضول بحثوں میں الجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی حل نہ کر سکے۔ بعینہ ہمارے متاخرین شعرار کا یہی حال ہوا ان کی قوت تخیلیہ قدما سے زیادہ ہے لیکن افسوس بالکل رائیگاں صرف کی گئی ایک شاعر کہتا ہے۔

گو شہارا آشیانہ مرغِ آتش خوار کرد　　　برق عالم سوز یعنی شعلۂ غوغائے من

اس شعر کے سمجھنے کے لئے امور ذیل کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے :

(۱) مرغِ آتش خوار ایک پرند ہے جو آگ کھاتا ہے (۲) آہ اور فریاد میں چوں کہ گرمی ہوتی ہے اس لئے آہ اور فریاد کو شعلہ سے تشبیہ دیتے ہیں (۳) مرغِ آتش خوار وہاں رہتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری فریاد میں اس قدر گرمی ہے کہ کانوں میں پہنچی تو وہاں آگ پیدا ہو گئی اس بنا پر مرغِ آتش خوار نے لوگوں کے کانوں میں جا گھونسلے بنائے ہیں کہ یہاں آگ نصیب ہوگی۔

متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ قوت تخیل کا استعمال بیجا طور سے ہوا ہے۔

تشبیہ و استعارہ یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال ہیں جن کے بغیر انشاپردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک عامی سے عامی بھی جب جوش و غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اُس کی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے۔ غم و رنج کی حالت میں انشاپردازی اور تکلف کا کس کو خیال ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں مثلاً کسی کا عزیز مرجاتا ہے تو کہتا ہے "سینہ پھٹ گیا" "دل میں چھید پڑ گئے" "آسمان ٹوٹ پڑا" "مجھ کو کس کی نظر کھا گئی" یہ سب استعارے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ استعارہ دراصل فطری طرز ادا ہے۔ لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلف کی حد تک پہنچا دیا۔

اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع اور بہادر ہے تو اگر انھیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے۔ اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر کی مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہوگی اور معمولی طریقہ کے بہ نسبت کلام میں کچھ زور پیدا ہو جائے گا۔ اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر ہے" تو زور اور بڑھ جائے گا لیکن اگر اُس شخص کا مطلق خیال نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اُس سے مُراد وہی شخص ہو تو استعارہ ہے۔ اسی مطلب کے ادا کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ شیر کا نام بھی نہ لیا جائے بلکہ شیر کے جو خصائل ہیں اُس

شخص کی نسبت استعمال کئے جائیں مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑگئی (ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے طریقہ کی بہ نسبت زیادہ لطیف ہے۔

جدّت و لطفِ ادا | شاعری کے لئے یہ سب سے مقدم چیز ہے بلکہ بعض اہلِ فن کے نزدیک جدّت ادا ہی کا نام شاعری ہے ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے۔ اُسی کو اگر جدید انداز اور نئے اُسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے۔

ایک دفعہ حجاج نے ایک بدّو سے پوچھا تم سے کوئی راز کی بات کہی جائے تو تم اُس کو چھپا سکتے ہو اُس نے کہا کہ "میرا سینہ راز کا مدفن ہے" یعنی راز سینہ میں مرکر رہجاتا ہے سینہ سے نکل کیوں کر سکتا ہے۔ اس بات کو اگر وہ یوں ادا کرتا کہ "میں راز کو کسی حالت میں بھی ظاہر نہیں کرتا" تو معمولی بات ہوتی لیکن طرزِ ادا کے بدل دینے نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا اور اب وہی بات شعر بن گئی۔ شاعری۔ انشا پردازی۔ بلاغت ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدّتِ ادا پر موقوف ہے۔

حُسنِ الفاظ | اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اُس کی تمام تر کوشش الفاظ کی حُسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصل انداز یہی ہے۔ بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پروا نہیں کرتے یہ ابن الرومی اور متنبی کا مسلک ہے۔

لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے، اور بندش کیسی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب

ـــــه جن لوگوں کے نزدیک شعر میں وزن ضروری نہیں وہ ہر شاعرانہ انداز بیان کو شعر کہتے ہیں۔

اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔ ظہوری کا ساقی نامہ نازک خیالی موشگافی اور مضمون بندی کا طلسم ہے۔ لیکن سکندر نامہ کا ایک شعر پورے ساقی نامہ پر بھاری ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ساقی نامہ میں الفاظ کی وہ متانت اور شان و شوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو سکندر نامہ کا عام جوہر ہے۔ حافظ کا شعر ہے ؎

گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم　　گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد

جو خیال اس شعر میں ادا کیا گیا ہے اس کو الفاظ بدل کر ادا کرو، شعر خاک میں ملجائے گا ذیل کے دونوں مصرعوں میں

ع۔ تھا بلبلِ خوش گو کہ چہکتا ہے چمن میں

ع۔ بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

مضمون بلکہ بعض الفاظ تک مشترک ہیں پھر بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیئے اور معنی سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہیئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پیدا ہو سکے گی اس لئے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ جو مضمون اس کے خیال میں آیا ہے اُسی درجہ کے الفاظ اُس کو میسر آ سکیں گے یا نہیں؟ اگر نہ آ سکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر اُنھیں سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہئے جو اس کے بس کے ہیں اور جن کو وہ عمدہ پیرایہ اور الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ کسی نے نہایت سچ کہا ہے ؎

برائے پاکیٔ لفظے شبے بروز آمد　　کہ مرغ و ماہیٔ باشند خفتہ او بیدا

یعنی "شاعر ایک لفظ کی تلاش میں رات رات بھر جاگتا رہ جاتا ہے جب کہ مرغ اور مچھلیاں تک سوتی ہیں"۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال، عمدہ سے عمدہ مضمون

عمدہ سے عمدہ نظم اس وجہ سے برباد ہو جائے کہ اس میں صرف ایک لفظ اپنے درجہ سے گر گیا

مبالغہ | جن لوگوں نے کذب اور مبالغہ کو شعر کا زیور قرار دیا ہے ان کی غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ کذب و مبالغہ میں تخییل کا استعمال کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر گھوڑے کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ایک منٹ میں ایک کرور کوس طے کر لیتا ہے تو شعر بالکل بے مزہ اور مہمل ہوگا۔ اس لئے جب کوئی شاعر اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہے تو ضرور ہے کہ تخییل سے کام لے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اُس گلگوں[1] کو   پھینک دے لے کے کبھی شرق سے تا غرب تلک

اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اسے یاد کر   عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

اِس سے ظاہر ہوا کہ مبالغہ میں کوئی حُسن پیدا ہوتا ہے تو تخییل کی بنا پر ہوتا ہے نہ اس لئے کہ وہ جھوٹ اور مبالغہ ہے۔

شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر وزبر کر سکتی ہے جو ملک میں ہل چل ڈال سکتی ہے جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے۔ جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے گو واقعیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تم نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ جاہلیت میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب میں روشناس کر دیتا تھا بہ خلاف اس کے ایران کے شعرا نے جن ممدوحوں کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اس کی یہی وجہ ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں واقعیت ہوتی تھی اس لئے اُن کا واقعی اثر ہوتا تھا ایرانی شعرا باتوں کے طوطے مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ہو سکتی تھی باقی ہیچ۔

---

[1] نام اسپ شیریں و بمعنا اُس اسپ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انیسِ ادب

حصّہ دوم

ز[illegible]

حمد

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا — تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں حقّا تیرا

عقل کیا دخل کرے کنہِ حقیقت میں تری — حوصلہ پست مرا مرتبہ اعلیٰ تیرا

راہ میں اُس کی جو ثابت قدمی ہو تجھ سے — سجدہ گہ جانیں مَلک نقشِ کفِ پا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں — سر وہ کٹ جائے کہ جس میں نہ ہو سودا تیرا

تو نے ہی اُس کو بنایا ہی یدِ قدرت سے — تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پُتلا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے وردِ اے دوست
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا
میں بھی دیکھوں گا دکھا مجکو تجلّائے جمال
میں بھی شائق ہوں صنم صورتِ موسیٰ تیرا
بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اُس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا
تجھ سے بیزار ہوں جاتا ہوں سوئے مُلکِ عدم
مُنھ نہ دکھلائے خدا پھر مجھے دنیا تیرا

مثنویات

مرغِ اسیرِ صیّاد

اِک مُرغ ہوا اسیرِ صیّاد
دانا تھا وہ طائرِ چمن زاد
بولا جب اُس نے باندھے بازو
کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مشتِ پر ہوں
پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے عوضِ دام
بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ
سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ
سُن - کوئی ہزار کچھ سنائے
کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت
عاجز ہو تو ہاریئے نہ ہمّت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجیے
جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجئے
طائر کا یہ سُن کلام صیّاد
بن دام ہوا غلام صیّاد
بازو کے جو بند کھول ڈالے
طائر نے تڑپ کے پَر نکالے
اک شاخ پہ جا چہک کے بولا
کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری مجھے اُڑایا
غفلت نے تری مجھے چھڑایا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے
تھا لعل نہاں شکم میں میرے

دے کے صیّاد نے دلاسا　　چاہا پھر کچھ لگائے لاسا
وہ بولا کہ دیکھ کر گیا جعل　　طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل

ارباب غرض کی بات سُن کر
کر لیجئے یک بیک نہ باور

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا　　سچ بتا تجھ میں ہے فوقیّت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا ہیں ؟　　تو ہے انسان کی دولت یا ہیں؟
ہے زمانہ میں بڑی بات تری　　دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا　　تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے　　اُس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے　　لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے　　لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما　　علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال　　لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر　　میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آ گئی میں جس کے کام　　زندہ تا حشر رہا اُس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا　　وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
مُنھ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں　　اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خُرد و کلاں　　پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو　　کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا　　درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں مُرکھائی سے مری سب لرزاں　　میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں　　ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے مری وہ شان عظیم　　کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو　　میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا　　جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سن کے کہا اے دولت　　شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر　　اپنی جڑ کی نہیں ہے تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی　　اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ　　تو ہوں اس چشمے کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں　　پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں　　تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا اگر عطر آگیں　　میں ہوں اس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال　　تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن کے قبضہ میں ہوں میں اے دولت　　تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو　　بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُن کی مٹھی میں ہے تو اے دولت　　طائرِ رشتہ بپا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود　　جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر　　جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجے گنوا　　لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لٹا دے ثروت　　پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز　　میری۔ ایک ایک پل ہی اُن کو عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس　　ہی مرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عرفا　　مجکو سرمایۂ دین و دنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں　　اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہی نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام　　نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ انھیں دین کی دولت ہاتھ آئے　　اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ　　نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے　　نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گُن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت　　ہی مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو　　بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہی میرا سراسر نقصاں
کہ ہی انمول مری ایک اک آں

جواں مردی کا کام

تھا کسی ملک میں ایک دولت مند　　حق نے تین اُس کو دیئے تھے فرزند
دُور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا　　باپ بیٹوں کی جواں مردی کا
باپ ہوں جن کے مروّت والے　　بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمّت والے
ہو چکا عمر کا جب سرمایہ　　ایک دن باپ کے جی میں آیا

گھر ہی تکرار کا یہ دولت و زر — مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر
جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم — آخر اک روز ہے مرنا تسلیم
بس کہ تھا اس کو بہت فکرِ مآل — ایک دن بیٹھ کے سب مال و منال
اِک گراں مایہ جواہر کے سوا — تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا
پھر کہا اُن سے کہ اے اہلِ ہنر — باپ کی جان فدا ہو تم پر
تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی — یہ جواہر ہے امانت اُس کی
باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن — پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دُھن
کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے — جس طرح ہو یہ جواہر لیجے
اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے — اُس کو یہ فکر سوا تھا سب سے
ایک دن اُس کا کوئی واقف کار — کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص نہ پیار
رکھ گیا آ کے جواں مرد کے پاس — ایک بھاری سی رقم بے وسواس
تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ — نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ
کچھ بھی نیت میں گر آ جائے خلل — تو یہ تھا عین خیانت کا محل
جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے — وسوسے دل میں بہت سے آئے
مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری — لی تھی جن ہاتوں اُنھیں ہاتوں دی
نفسِ سرکش کو کیا مات اُس نے — دی رقم اور نہ دی بات اُس نے
صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا — وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو اُن کے دی جب یہ خبر — ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر
اِک بُرائی سے بچے تم تو کیا — اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز — شرم کی جا ہے تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا	میں جو دریا کی طرف جا نکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفلِ صغیر	گر کے پانی میں چلا صورتِ تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور	ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ پدر
آنکھ تھی جانبِ مادر نگراں	ماں کنارے پہ اُدھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا	پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر	جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اُس کی	پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا	لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا
باپ نے سُن کے یہ تب اُس سے کہا	کام مَردوں کے یہی ہیں بیٹا
آدمیت کا کیا تم نے کام	جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے	نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

پسرِ خُرد کا اب سُنئے بیاں	جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز	باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز
بات گو لائقِ اظہار نہیں	آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خوب اک روز گھٹا چھائی تھی	رات آدمی کے قریب آئی تھی
شبِ تاریک میں وہ ابرِ سیاہ	کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ
اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا	خوف چھاتی پہ چڑھ رہا تھا
ساتھ تم تھے نہ کوئی بھائی تھا	میں تھا اور بس تنہائی تھی
کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ	جس سے آگے کو کھلی راہِ نگاہ
پڑی اِک غار پہ واں میری نظر	جس کی صورت سے برستا تھا خطر

موت کھوئے ہوئے تھی منھ گویا
جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا

دیکھتا کیا ہوں کہ اک مردِ غریب
جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب

جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی
یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی

جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش
غار کے موُنھ میں پڑا ہے مدہوش

اپنی ہستی کی نہیں اُس کو خبر
اور قضا کھیل رہی ہے سر پہ

اجل آجائے تو ہے روک نہ تھام
ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام

اتنے میں اور جو بجلی چمکی
شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی

مرد نکلا وہ شناسا میرا
تھا مگر خون کا پیاسا میرا

مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری
ایک مدت سے چلی آتی تھی

واں عداوت پہ گر آؤں اپنی
اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی

مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار ق
اک اشارہ میں وہ تھا لقمۂ غار

آگیا مجھ کو مگر خوفِ خدا
اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا

مرتے کو مارنا بے دردی ہے
ہے بہت دور جواں مردی سے

حوصلہ کا ہے یہی وقت کہ آج
ہے عدو اپنی مدد کا محتاج

جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار
کہ اسے کیجئے چل کر بیدار

واں سے جا۔ اُس کو اُٹھا لایا میں
موت کی زد سے بچا لایا میں

مُنھ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اُس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

سن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا
اور چھاتی سے لیا اُس کو لگا

پھر بڑے بیٹوں کو بُلوا کے کہا
بولو اب کس سے ہوا کام بڑا

داستاں جب یہ سنی دونوں نے
باپ سے عرض یہ کی دونوں نے

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف
پوچھئے ہم سے تو ہے یہ انصاف

جس جواہر کے طلب گار تھے ہم — اُس کے لائق تھے نہ حق دار تھے ہم
اور کو اس کی ہوس ناحق ہے — حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے
باپ یہ سن کے ہوا شاد بہت — اُن کے انصاف کی دی داد بہت
چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس — پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس

پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا
لو یہ ہو تم کو مبارک بیٹا

پھول کی فریاد

کیا خطا میری تھی ظالم تو نے کیوں توڑا مجھے — کیوں نہ میری عمر ہی تک شاخ پر چھوڑا مجھے
خون میرا اپنے سر لے کر تجھے کیا مل گیا — پیڑ کا لختِ جگر توڑا تجھے کیا مل گیا
حسنِ دلکش ہو کے میری جان کا دشمن ہوا — میرے حسن کا رنگ خود میرے لئے [illegible]
جانتا گر اس ہنسی کے دردناک انجام کو — میں ہوا کے گدگدانے سے نہ ہنستا نام کو
شاخ نے آغوش میں کس لطف سے پالا مجھے — تو نے ملنے کے لئے بستر پہ لا ڈالا مجھے
میری خوشبو سے بسائے گا بچھونا رات بھر — صبح ہوگی تو مجھے تو پھینک دے گا [illegible]
پتیاں اُڑتی پھریں گی منتشر ہو جائیں گی — رفتہ رفتہ خاک میں مل جائیں گی [illegible]
تو نے میری جان لی دم بھر کی زینت کے لئے — کی جفا مجھ پر فقط تھوڑی سی زینت کے لئے
دیکھ میرے رنگ کی حالت بدل جانے پہ ہے — پتی پتی ہو چلی بے آب مرجھانے پہ ہے
پیڑ پانی مجھکو دیتا تھا زمیں سے کھینچ کر — وہ کہاں اور میں کہاں [illegible]
پیڑ تھا مجھ سے نہال اب اُس پہ وہ خوبی کہاں — قدر تو بے مہر [illegible]
جس کی رونق تھا میں بے رونق وہ ڈالی ہو گئی — حیف ہے بچے سے ماں کی گود خالی ہو گئی

تتلیاں بے چین ہوں گی جب نہ مجکو پائیں گی
غم سے بھونرے روئیں گے اور بلبلیں چلائیں گی

دودھ شبنم نے پلایا تھا ملا وہ خاک میں
کیا خبر تھی یہ کہ ہے بے رحم گلچیں تاک میں

مہر کہتا ہے مری کرنوں کی سب محنت گئی
ماہ کو غم ہے کہ میری دی ہوئی رنگت گئی

اپنے پانی کے تلف ہونے سے بے خود ہے زمیں
اس قدر حسرت میں ڈوبی ہے کہ گویا دم نہیں

دیدۂ حیراں ہے کیاری باغباں کے دل پہ داغ
شاخ روتی ہے کہ ہے ہے گل ہوا میرا چراغ

میں بھی فانی تو بھی فانی سب ہیں فانی دہر میں
اک قیامت ہے مگر مرگِ جوانی دہر میں

شوق کیا کہتا ہے تو سن لے سمجھ لے جان لے
دل کسی کا توڑنا اچھا نہیں یہ جان لے

سردی

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

جتنا عالم تھا کاشمیر ہوا
بلکہ کہیے کہ زمہریر ہوا

کہرا پڑنے کو کہتے ہیں سب یار
ٹھنڈے سے ہے جہاں کے دل میں غبار

یک دیکھا میں غور کرکے آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کے بھاپ

پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبزہ وہ شال کی رضائی ہے

بس کہ یخ بستہ بحر میں ہے آب
برف کی ہے رکابی ہر گرداب

تیغ سے کاٹتا ہے اب وہ چند
آب میں اس قدر ہوئی ہے گزند

دیکھ گل پر صبا نہیبِ برد
پھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد

گر پڑے برگ تاک جھڑ کے تمام
بلبلیں مر رہیں اکڑ کے تمام

آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے
گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے

بے حرارت ہیں سردی کے مارے	طرح یاقوت کے اب انگارے
جاڑے لگنے کا ہیچ تنک ہے حرف	لپٹی رہتی ہی نمدوں ہی میں برف
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات	کالے کمبل میں رات کلٹے ہے رات
فرطِ سرما سے دیکھئے جس کو	دست زیر بغل ہی مثل سبو
اس پہ جاڑے سے ہی اُن کا حال	ناک سے چھوٹتا نہیں رومال
کوئی اب جا سے ہل نہیں سکتا	گھر سے باہر نکل نہیں سکتا
پھر جو کوئی ندان نکلے ہے	ٹھنڈ کے مارے جان نکلے ہے
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور	جس طرح ناشپاتی و انگور
اہل حرفہ کو کیجئے جو نگاہ	کاروبار اُن کا ہو گیا ہی تباہ
پیٹ کر سر کہے ہی بھٹیارا	ہائے اب کیا کروں میں بیچارا
آہ قنّاد بھر کے یوں بولے	بنی تھی قند ہو گئے اولے
دیکھ حلوائی کو جو بیٹھے کہیں	برفی چھٹ کچھ دکان میں شے نہیں
غرض ایسی ہی کچھ پڑی ہی ٹھنڈ	مٹ گیا زمہریر کا بھی گھمنڈ
سوداؔ آخر ہی سردی کا مذکور	شعر بھی گر خنک ہوں رکھ معذور

آگے جاتا نہیں ہی اب بولا
ہو گئی ہے زبان بھی اولا

معجونِ مرضِ گناہ

روایت ہی کہ شبلی شیخ کامل	بزرگ پاک باطن صاحبِ دل
سوئے دارالشفا گزرے تو دیکھا	کہ بیٹھے ہیں معالج اور ...

دوائیں سیکڑوں آگے دھری ہیں — گیاہِ خشک سے پُڑیاں بھری ہیں
مریضوں سے مکاں سارا ہی معمور — کوئی نزدیک ہی ان کے کوئی دور
کوئی نالاں ہی کوئی چُپ کھڑا ہی — کوئی بیٹھا ہے اور کوئی پڑا ہی
اطبا سب ہیں صرفِ چارہ سازی — زباں پر سب کے حرفِ چارہ سازی
کہا شبلیؒ نے بھی اک چارہ گر سے — بہا کر اشک اپنے چشمِ تر سے
کہ مجکو بھی گناہوں کا مرض ہے — شفا حاصل ہو اس سے یہ غرض ہے
اگر اس کی دوا بھی ہو ترے پاس — نہ توڑ اس وقت مجھ بیمار کی آس
کہ میں اس درد سے ہوں سخت بیتاب — رہا کرتا ہوں اکثر بے خور و خواب
کہا اُس نے نہیں اس کی دوا کچھ — نہیں تدبیر جز فضلِ خدا کچھ
یہاں ہوگا نہ اس غم سے افاقہ — طبابت کو نہیں اس سے علاقہ
کوئی دیوانہ تنکے چُن رہا تھا — یہ باتیں جو ہوئیں سب سن رہا تھا
اُٹھا کر سر کہا شبلی ادھر آ — بتا دوں میں دوا اُس کی ادھر آ
حیا کے پھول صبر و شکر کے پھل — نیاز و عجز کی جڑ غم کی کونپل
نہالِ صدق کی ڈالی کے اوراق — ادب کی چھال تخمِ حسن و اخلاق
ریاضت کا اگر ہاون ہو ممکن — تو اُس میں کوٹ ان کو رات اور دن
عرق اشکِ پشیمانی کا لے کر — کیا کر روز اُس میں خوب اُنھیں تر
کئی چلّے یہی معمول کر لے — پھر ان کو دیگچی میں دل کی بھر لے
اجاقِ شوق پر رکھ کر پکانا — پہ بے خامی تو جان اپنی جلانا
مناسب چھاننے کا بھی ہے سامان — صفائے قلب کی صافی میں تو چھان
جو چھن کر صاف ہو جائے وہ پانی — ملانا شکرِ شیریں زبانی
کہ یہ معجون کھاتی ہی بڑی آنچ — محبت کی اسے دینا کڑی آنچ

غرض جب ہو چکے معجون تیار — یہ ہے نقصاں نہ باقی کوئی زنہار
تو رکھنا حفظ کی ڈبیا میں بھر کے — ہوائے اتقا سے سرد کر کے
جہاں تک تجھ سے کھائی جائے کھانا — کچھ اس کی قدر شربت پر نہ جانا
مضر ہونے کا اندیشہ نہیں کچھ — ضرر اس نے نہیں بخشا کہیں کچھ
موادِ فاسدِ عصیاں کے حق میں — نہیں مثل اس کا ہستی کو ورق میں
ہوا ہو جائے گا دردِ معاصی — جو چاہے امتحاں کر دیکھے عاصی
یہ نسخہ ہے نہایت آزمودہ — اطبائے معارف کا ستودہ
کہا شبلیؒ نے حضرت بارک اللہ — یہ نسخہ ہے کرامت بارک اللہ

یہ سن کر ہو گیا غائب وہ مجنوں
پھر آئے شیخ شبلی دل جگر خوں

مثنوی صبح امید

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی — بسترِ خواب میں سے لے کے اٹھا انگڑائی
آنکھ مل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں — ذرہ ذرہ میں نظر آیا رخِ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہہ دور انداز — تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ — جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ
برگ برگ اس کا ہے آئینۂ پیشِ نظر — جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوؤں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر — جن سے نکلیں گے ثمرہائے تمنا یکسر
قلۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز — رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہِ دراز
تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اس کی — اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اس کی

اُس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے
دم اُکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے

گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آ رہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمّت میں ہے مقدور بہت

جشنِ شاہانہ کا ساماں نظر آتا تھا وہاں
سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں

دل اُس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے تھے
گویا ذرّے سوئے خورشید اُڑے جاتے تھے

اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا
جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوئے کاہ رُبا پہونچا میں
الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہونچا میں

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گلِ خودرو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز
رنگِ گل اُس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

بر سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر ہے بدامانِ جبل مار رہا
سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی
اس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگِ رخ کو گلِ گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

اس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال
پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہ تاجوری
ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اُس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ
کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اُس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے

رخ جو ہے آئینۂ روئے تمنا اُس کا
شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جادو اُس کا

اک طرف عقل ہے اک سمت کو تدبیر کھڑی
آگے جامِ مئے غفلت لیے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا
کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُس کی
پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہے اک سو اُس کی

ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے
تڑپ اُٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے

اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے
اپنے دامانِ تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے

دمبدم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی
بوئے اُمید ہے اک اک کو سنگھاتی جاتی

دیر تک دل رہا تصویرِ تہِ آئینہ
پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ

غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے
شجرِ حیرت پہ لیکن جو نظر کی میں نے

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہوائے اقبال

دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوشحالی
آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی

آؤ تم قیدِ تعلق سے ہو آزاد بہت
اپنی وارستگیِ دل میں ہو تم شاد بہت

آؤ یاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو
لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو

آؤ اس سایہ میں تم ابرِ گہر بار ہے یہ
یعنی شہزادیِ اُمید کا دربار ہے یہ

اس کے نغمہ سے جو یہ رازِ پُر افسوں نکلا
دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا

آ کہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا
اور مثل ہے کہ بہ اُمید ہے قائم دنیا

آ کہ ہے تیری ہوا میں دلِ شیدا گلشن
لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلبن

دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا
کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا

کونسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا
کون انساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا

کونسا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں
کونسا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں

کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری
کونسا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری

تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکہ ترا چلتا ہے

مثنوی خوابِ امن

(خسروِ امن کا دربار)

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غم دیدہ بہت

شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھکو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھکو

خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار

اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا — مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا — دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

صبح دن رات گھڑی شوق سے ہنستی تھی وہاں — نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

دولت و عیش و طرب تھے اُمرائے دربار — کرتے تھے نظم و نسق جماعہ برائے دربار

دل میں افکارِ پریشاں کا نہ تھا نام وہاں — ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے — دامنِ امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چُنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

(علم امن کا شکریہ ادا کرتا ہے)

وفعتاً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے — پھر عجب شان سے وہ مردِ خوش اعمال آئے

جسمِ پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا — بر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں پر شملۂ دستار جو آجاتا تھا — اُن کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت — رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدس میں کیا پیری نے — اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھاتے آتے — اور بغل میں کئی جزدان دباتے آتے
سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے — ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے
الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے — پہلے سب نے بادب دستِ دعا پھیلائے
پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے — علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے
اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا — ہے ہر اک شہرت و تعریف سے معروف سدا
اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں — اور جہاں میں اُنھیں فکرِ سحر و شام نہیں
دم بدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے — آتے ہیں کارگہِ دہر میں اُستاد نئے
درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری — ہیں یہ جمعیتِ خاطر کی ہی باتیں ساری
جو ہمیں چاہیئے موجود ہیں سارے ساماں — ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں
اے شہِ امن یہ سب فیضِ کرم تیرے ہیں — کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

مثنوی ابرِ کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے — دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا — جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا
شاہانِ ماسلف کے مرقع عجیب ہیں — روشن سب اُس میں عہدِ بعید و قریب ہیں
تحریر تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے — آتی ہے دم بدم نئی تصویر سامنے
اس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے — دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے
قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے — موسم بموسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے — گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

عالم تھا شعلہ بیز و فلک شعلہ ریز تھا — اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
منھ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی — اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی
دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی — پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے — اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفلِ نبات پیاس کے مارے بلک گئے — خلقِ خدا کے نالے بہت دُور تک گئے
بیتاب ہو کے سینہ سے ہر دل نکل چلا — اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا
دل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے — انسان تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے
پر اب ہے ورود دورہ شہِ برشگال کا — چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا
گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا — اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا
فرمانِ راحتِ سحر و شام آ گیا — خلقِ خدا کی جان کو آرام آ گیا
اے ابر آ، کہ تو تو شہِ برشگال ہے — جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور — تیری زمیں ہے اور ترا آسماں ہے اور

نوروزِ آب و رنگ بہارِ جہان ہے
تو نو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

مسدّسات

حالی

تعصب کہ ہے دشمنِ نوعِ انساں — بھرے گھر کئے سیکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزمِ نمرود جس سے پریشاں — کیا جس نے فرعون کو نذرِ طوفاں

گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

وہ یاں اک عجب بھیس میں جلوہ گر ہے   چھپا جس کے پردوں میں اس کا ضرر ہے
بھرا زہر جس جام میں سر بسر ہے   وہ آبِ بقا ہم کو آتا نظر ہے
تعصب کو اک جزوِ دیں سمجھے ہیں ہم
جہنّم کو خلدِ بریں سمجھے ہیں ہم

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے   کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے   نہ ملّا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے
اگر نشۂ مے ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں

جنھیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں   سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں
موافق نہیں جن سے ایامِ دوراں   نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض سے ہے رنجور کوئی

اگر مرجعِ خلق ہے ایک بھائی   نہیں ظاہرا جس میں کوئی برائی
بھلا جس کو کہتی ہے ساری خدائی   ہر اک دل میں عظمت ہے جس کی سمائی
تو پڑتی ہیں اس پر نگاہیں غضب کی
کھٹکتا ہے کانٹا سا آنکھوں میں سب کی

بگڑتا ہے جب قوم میں کوئی بن کر   ابھی بخت و اقبال تھے جس کے یاور
کبھی گردنیں جھکتی تھیں جس کے در پر   مگر کر دیا اب زمانے نے بے پر
تو ظاہر میں گو کڑھتے ہیں پر خوش ہیں جی میں
کہ ہمدرد ہاتھ آیا اک مفلسی میں

اگر اک جواں مرد ہمدردِ انساں — کرے قوم پر دل سے جان اپنی قرباں
تو خود قوم اُس پر لگائے یہ بہتاں — کہ ہے اس کی کوئی غرض اس میں پنہاں
وگرنہ پڑی کیا کسی کو کسی کی
یہ چالیں سراسر ہیں خود مطلبی کی

نکالے گر اُن کی بھلائی کی صورت — تو ڈالیں جہاں تک بنے اس میں کھنڈت
سُنیں کامیابی میں جب اس کی شہرت — تو دل سے تراشیں کوئی تازہ تہمت
مُنھ اپنا گو ہو دین و دنیا میں کالا
نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا

اگر پاتے ہیں دو دلوں میں صفائی — تو ہیں ڈالتے اُن میں طرحِ جدائی
ٹھنی دو گھروں میں ہو جس دم لڑائی — تو گویا تمنّا ہماری بر آئی
پس اس سے نہیں مشغلہ خوب کوئی
تماشا نہیں ایسا مرغوب کوئی

تغلّب میں بدنیتی میں دغا میں — نمود اور بناوٹ فریب اور ریا میں
سعایت میں بہتان میں افترا میں — کسی بزم بیگانہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے
بڑھے پھر نہ کیوں شانِ اسلام ہم سے

خوشامد میں ہم کو وہ قدرت ہے حاصل — کہ انساں کو ہر طرح کرتے ہیں مائل
کہیں احمقوں کو بناتے ہیں عاقل — کہیں ہوشیاروں کو کرتے ہیں غافل
کسی کو اتارا کسی کو چڑھایا
یوں ہی سیکڑوں کو اسامی بنایا

[illegible]

روایات پر حاشیہ اک چڑھانا قسم جھوٹے وعدوں پہ سو بار کھانا
اگر مدح کرنا تو حد سے بڑھانا مذمت پہ آنا تو طوفاں اٹھانا

یہ ہے روزمرہ کا یاں ان کے عنواں
فصاحت میں بے مثل ہیں جو مسلماں

[illegible]

اسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے اَن بن سمجھتے ہیں ہم رہنماؤں کو رہزن

یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

سب سے بڑی نعمت

کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل، جس سے ملے دین و دنیا کہا گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرا

کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے

کہا گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا در ہو یہ بھی اگر بند اس پر کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر

وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

انگریزی حکومت

حکومت نے آزادیاں ہم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں

تسلط ہے ملکوں پہ امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی — نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقض ہے ملت کے ارکاں کا کوئی — نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دو دھڑلّے سے مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں — نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں — تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں — گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں — شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

پہونچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں — چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک برّ اعظم کی خبریں — کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی — کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقّی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی — یہ ہر سو سے آوازِ پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

مولوی نذیر احمد مرحوم

دنیا عجیب مرحلۂ بے ثبات ہے　　ہر ایک ذی حیات کو آخر ممات ہے
یاں امن ایک لحظہ نہ دن ہے نہ رات ہے　　جس کو فنا نہیں ہے وہی ایک ذات ہے

بیٹھی ہے موت تاک لگائے کمین میں
لے جائے گی یہ کھینچ کے آخر زمین میں

ایسا مکاں بتاؤ کہ بن کر گرا نہ ہو　　پیدا ہوا ہے کوئی بشر جو مرا نہ ہو
ہے کوئی حال جس میں تغیر ذرا نہ ہو　　حادث نہ ہو تو دخلِ چون و چرا نہ ہو

فانی ہر ایک چیز ہے فانی جہان ہے
مقصود اس فنا سے مگر امتحان ہے

توفیقِ کارِ نیک ہمیں اے کریم دے　　دل میں صلاح دے ہمیں طبعِ سلیم دے
شوقِ سلوک زاویۂ مستقیم دے　　ایمان درمیانۂ اُمید و بیم دے

ہم کو نہیں ہے بحث عذاب و ثواب سے
تیری رضا ملے ہمیں تیری جناب سے

دل لوثِ حبِّ دولتِ دنیا سے پاک ہو　　دے وہ غنا کہ آنکھ میں اکسیر خاک ہو
لالچ ہو فائدہ کا نہ نقصان کا باک ہو　　دیں سے شغف[1] ہو دین ہی میں انہماک[2] ہو

فرقِ نیاز فرشِ زمیں پر پڑا ہوا
ہمت کا پاؤں عرشِ بریں پر گڑا ہوا

---

[1] شیفتگی　　[2] مصروفیت ۔

ہر دم خیال موت کا پیشِ نظر رہے — جب تک جئے جئے جب اجل آئی مر رہے
رہرو ہمیشہ چاہیئے باندھے کمر رہے — دنیا وطن نہیں ہے کہ آئے بسر رہے
آ گئے ہیں ہم جہاں میں تو جانا ضرور ہے
سارا ہی قافلہ سرِ راہِ سرور ہے

پھر بعدِ مرگ کیسی بنے کچھ خبر نہیں — یہ وہ خطر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں
پر کیا ہی ڈھیٹ ہم ہیں کہ اس کا بھی غم نہیں — عقلِ معاد[1] سے ہمیں بہرہ مگر نہیں
رب العباد نعمتِ فکرِ معاد دے
فکرِ معاد دے ہمیں ذکرِ معاد دے

غفلت کرا رہی ہے یہ ساری شرارتیں — ہموار ہی ہے رہنے کو پکی عمارتیں
اللہ رے دلیریاں بل بے جسارتیں[2] — دنیا کمائیں دین کی کر کے خسارتیں[3]
غفلت کا کر علاج کہ اصلِ مرض ہے یہ
تیرا ہی کچھ بھلا ہو ہماری غرض ہے یہ

غفلت نہ ہو تو کینہ و بغض و حسد نہ ہو — جھگڑا نہ ہو لڑائی نہ ہو رد و کد نہ ہو
بھائی کی پیٹھ پیچھے کبھی ذکرِ بد نہ ہو — انساں مشارکِ صفتِ دام و دد نہ ہو
غفلت سے اس جہان میں سارا فساد ہے
غفلت کو آؤ مار ہٹائیں جہاد ہے

بہادرانِ جنگ کا خیر مقدم

ہند میں دھوم ہے جانبازِ وطن آ گئے ہیں — سروِ اتراتے ہوئے سوئے چمن آ گئے ہیں

---

[1] آخرت ۱۲ — [2] دلیریاں ۱۲ — [3] نقصان ۱۲

باندھ کر سر سے شجاعت کا کفن آئے ہیں   سر ہتھیلی پہ لئے خستہ بدن آئے ہیں

منھ نہ پھیرا کبھی چلتی ہوئی شمشیروں سے
چھلنی چھلنی کیا دشمن کا بدن تیروں سے

جان پر کھیل گئے مورچہ جانے نہ دیا   تیغِ ہندی کے مقابل کبھی آنے نہ دیا

وار پر وار کئے پاؤں جمانے نہ دیا   جو گرا فوج سے دشمن کی اٹھانے نہ دیا

رن میں لڑتے رہے کٹ کٹ کے ہمارے بانکے
درد کرتے ہی رہے زخمِ جگر کے ٹانکے

تیغ سے کر دیا چورنگ بدن دشمن کا   دم میں بھٹے کی طرح اڑ گیا سر دشمن کا

کیوں نہ پامال ہو برباد ہو گھر دشمن کا   تھا مٹاتا ہی انھیں تدِ نظر دشمن کا

تیغ کے گھاٹ پیاسوں کو قضا لے آئی
جھاڑ میں جھونکنے تنکوں کو ہوا لے آئی

حوصلے دل کے نکالے سرِ میداں کیا کیا   کر دیا دشمنِ بدبخت کو بے جاں کیا کیا

پردۂ شرم میں ہے سر بگریباں کیا کیا   جرأتِ ہند کو ہے دیکھ کے حیراں کیا کیا

اور تو اور یہ حالت رہی بیماروں کی
دم لیا بھی تو لیا چھاؤں میں تلواروں کی

حق ادا خوب کیا تم نے نمک خواری کا   درحقیقت یہی موقع تھا وفاداری کا

ہے نشاں دہر پہ یہ ہند کی بیداری کا   مٹ گیا نام شجاعت سے ستمگاری کا

کیونکہ برٹش کا ہے اقبال ہمارا اقبال
اپنی سرکار زمانہ میں ہے بالا مال

صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح　　ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو تیغ سے اُٹھایا نقابِ شب　　در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب　　دفتر کشائے صبح نے اُلٹی نقابِ شب

گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہنچا جو مُہر مہر سے فرمانِ عزلِ شب　　گردوں پہ عاملانِ سحر کا ہوا نصب
منشیِ آسماں معِ دفتر ہوا طلب　　بس جا بجا سے اُٹھ گئی انجم کی فوج سب

تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی
برخاستگی چراغوں کی پروانگی ہوئی

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں　　چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار پر گُلِ مہتاب کی خزاں　　مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

گرمی

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لُو وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام — مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلی تھے تو چیتے سیاہ فام — پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ موم خام
سرخی اڑی تھی پھول سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سایہ کی چاہ سے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور — جنگل میں اڑتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تابِ تپ کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کا اضطراب — کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

میرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
روح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ. تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[1] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منتِ پذیرِ شانہ ہے
شمع بھی جویندۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّہ ذرّہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو ہیں پوشیدہ تیرے خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

---

[1] وہ مقام ہے جہاں مشہور شاعر گیٹے مدفون ہے

مخمس

یاس کی خوشی

دم ناک میں کیا تھا طوفانِ غم نے میرا ٹکڑے جگر کیا تھا حسرت کے غم نے میرا
خرمن جلا دیا تھا برقِ الم نے میرا بس جان جا چکی تھی تو نے مجھے بچایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سبز باغ برسوں امید نے دکھائے تھے وعدے اس کے جھوٹے سب میں نے آزمائے
دم بازیوں سے اس کی دھوکے بہت سے کھائے پھندے سے اس کے تو نے آخر مجھے چھڑایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

امید کے وہ وعدے جھوٹی ہوائیاں تھیں سب جَو فروشیاں تھیں گندم نمائیاں تھیں
دن رات کوششیں تھیں اور نارسائیاں تھیں دھوکے کا تو نے پردہ آخر کو آ اٹھایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آرزو کی تپ تھی کیا شوق کا جنوں تھا تن من جلا رہا تھا کیا شعلۂ دروں تھا
حرماں کے نشتروں سے دل تھا کہ غرقِ خوں تھا زخموں پہ جاں کے تو نے مرہم سا آ لگایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آہِ سرد تو نے ٹھنڈی ہوا چلائی گہری سی نیند جس سے درد دروں کو آئی
کیا یاس تو نے میٹھی لوری اسے سنائی کیا میٹھی تال سُر میں کچھ تو نے گنگنایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سکھ کی زندگی ہے اب شوق ہے نہ حسرت نے آرزو نہ حرماں دونوں پہ بھیجو لعنت
اے یاس تجھ کو شاباش اے یاس تجھ پہ رحمت امید دور ہو چل، تو نے بہت ستایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

گزرے گی خوب اپنی اب میں ہوں اور تو ہی — تجھ کو ہی مجھ سے الفت یاں تیری جستجو ہی
میں جسم ہوں تو جاں ہی میں پھول ہوں تو بو ہی — صد شکر ہی خدا نے مجھ سے تجھے ملایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

مثلث

ہوائی جہاز

اے پرندِ مغربی ہوتا ہے جب تو پرفشاں — تنگ ہو جاتا ہی میدانِ فضائے آسماں
دیکھتے ہیں ٹکٹکی باندھے تجھے اہلِ جہاں

اے ہوا میں اڑنے والے اے پری پیکر جہاز — اے فضا کے طائرِ بے بال خوش منظر جہاز
ہاں دکھا دے آج چل کے مجکو سیرِ آسماں

ذہن کو سکتہ ہی تیری رفعتِ پرواز پر — عقل کو حیرت ہی تیری طاقتِ پرواز پر
بے پروبال اور اس حد کی سبک پروازیاں

مائلِ اوجِ ترقی ہے ترا ایک خیال — تو نے آساں کر کے دکھلایا ہی اک امرِ محال
کونسی قوت بتا دے تیرے دل میں ہی نہاں

گو کہ ہیں پستی کے ساکن آج ہیں رفعت نصیب — عالمِ بالا کے منظر ہوتے جاتے ہیں قریب
جا رہے ہیں چین سے بیٹھے سرِ تختِ رواں

جز فضا ملتا نہیں ہے اب کسی شے کا اثر — آسماں جس کو سمجھتے تھے وہ ہی مدِ نظر
تو ہی تو ہے صرف مابینِ زمین و آسماں

یوں اڑیں گے وہم بھی ہوتا نہ تھا اس بات میں — بچپنے میں ہاں اڑا کرتے تھے وہ بھی خواب میں
آج دکھلایا ہی بیداری میں تو نے یہ سماں

کوئی قوت روک لے تجھ کو بہت دشوار ہی — دل ہوا کا تو نے برمایا ہے وہ رفتار ہی
اس کی قدرت ہی ہزاروں سے کہاں اور ہم کہاں

تجھ سے ظاہر ہو گئی اس عصر کی دانشوری　　قوتِ سائنس تیرے پُرزے پُرزے میں بھری
عقل کا اصلی مرقع علم کا اصلی نشاں

ایئرشپ تو ہے یا یورپ کا علمِ معتبر　　یہ زمانہ اُڑ رہا ہے تیری صورت میں مگر
طائرِ عقلِ رسا کا تجھ پہ ہوتا ہے گماں

جا رہا ہے تو بلندی پر غبارے کی طرح　　چڑھ رہا ہے موسمِ گرما کے پارے کی طرح
قابلِ نظارہ ہے تیری ترقی کا سماں

غزلیات و قطعات

حکیم مومن خاں مومن

(۱)

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں　　حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا
نالہ اک دم میں اُڑا ڈالے دھوئیں　　چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
روزِ محشر کی توقع ہے عبث　　ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

---

(۲)

بے صبر کو کہاں تپِ داغِ جگر سے فیض　　گلچیں کو کب ہوا شجرِ بارور سے فیض
بالطبع گر کریم ہو تو مفلس بھی ہے کریم　　ہوتا ہے سائے کا شجرِ بے ثمر سے فیض
ہے چرخ سے اُمیدِ کشائش ہمیں عبث　　کس کو ہوا ہے خانۂ وابستہ در سے فیض
ملنے کو خاک ہی میں تجلیوں کا ماں ہے　　دیکھو تو ہے کسی کو بھی غنچہ کے زر سے فیض
کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا
تھا سب کو اس کی ذاتِ سراپا ہنر سے فیض

کس ضبط پر شرار فشاں ہے فغانِ شمع　　اِک برق تھی جو لال نہ ہوتی زبانِ شمع
دل گرمیِ فریب پہ بھی میں نثار ہوں　　پروانہ کیا مجال کرے امتحانِ شمع
آتا ہے بیکسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم　　روتی ہے شمع آپ سرِ کشتگانِ شمع
صحبت میں ایک رات کو کیا محو ہو گئے　　اس بزم میں سحر کو نہ پایا نشانِ شمع

خواجہ حیدر علی آتش

(۱)

حشر کو بھی دیکھنے کا اس کے ارماں رہ گیا　　دن ہوا پر آفتاب آنکھوں سے پنہاں رہ گیا
جوشِ وحشت میں بیاباں کو گیا مانندِ روح　　جسم خاکی کی طرح سے میرا زنداں رہ گیا
دوستی نبھتی نہیں ہرگز فرومایہ کے ساتھ　　روح جنت کو گئی جسم گلی یاں رہ گیا
حسن میں سب عزت و ذلت خدا کے ہاتھ ہے　　گُل کو پیراہن ملا تو غنچہ عریاں رہ گیا
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ　　ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
کھینچ کر تلوار قاتل نے کیا مجھکو نہ قتل　　شکر ہے گردن تک آتے آتے احساں رہ گیا

---

(۲)

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں　　حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں
صدا یہ قبر سے بیدار دل کو آتی ہے　　عمل جو نیک ہوں تو ایسی خوابگاہ نہیں
خیال اس میں ہے لازم سیاہ چشموں کا　　لباس کعبۂ دل کا مرے سیاہ نہیں
عذابِ گور ہے دنیا کے رنج سے بدتر　　سوا خدا کے کرم کے کہیں پناہ نہیں
فقیروں کے قدم مار اس میں اے آتش　　طریقِ احمدِ مرسل سی شاہ راہ نہیں

---

(۳)

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے　　زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل　　یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی　　قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

بہت آتا ہے یاد اے صبر مسکیں
خدا خوش رکھے تجکو تو جہاں ہے
وطن میں اپنے اہل شوق کی طرح
سفر میں روز و شب ریگ رواں ہے
سعادت مند قسمت پر ہیں شاکر
ہما کو مغز یا دام استخواں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)
بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ
غزل میں وہ رنگت نہیں تیرے حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

---

(۲)
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں
تاج فغفور و تخت خاقانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتم سلیمانی

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں (۳) نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

شیخ امام بخش ناسخ

اے ہمسفر نہ پوچھ عبث ہے کہاں سرا (۱) ہم ہیں مسافر اور جہاں کارواں سرا
جس میں کہ ہم نے تم نے کیا ہے بہم مقام عشرت سرا ہوئی ہے وہ اے جانِ جاں سرا
دنیا میں اکل و شرب ہے حاضر مسافرو! اللہ نے بنائی ہے کیا میہماں سرا
غافل رہو نہ کوچ سے گھر جان کر اسے ارمان کا مقام ہے یہ ایرماں سرا
ناسخ وطن میں دیکھئے دیکھینگے گھر کو کب غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکاں سرا

(۲)

مظہر وہ بت ہے نورِ خدا کے ظہور کا نقشِ قدم سے سنگ کو رتبہ ہے طور کا
کوثر کی موج کیوں نہ ہو اپنی نگاہِ پاک یاں چشمِ تر ہے جام شرابِ طہور کا
خالی نہیں فروغ سے قاتل کی کوئی بات تلوار کو بھی چاہیئے اب سنگ طور کا
مدت سے بے حضور ہوں جو میں حضور سے اب قافیہ بھی بندھ نہیں سکتا حضور کا
آواز تیری نغمۂ داؤد ہے اگر عالم ہے صاف مصحفِ و پرِ زبور کا
ناسخ لگے جو سنگ تو سودا نے یہ کہا ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

زنہار ہو جیو نہ دلا مبتلائے حرص (۳) ذلت بھی دوڑی آتی ہے ناداں قفائے حرص

دنیا میں در بدر مجھے کب تک پھرائے حرص　　یارب قناعت آئے کہیں جلد جائے حرص
دنیا کی ساری خاک اگر ہو غذائے حرص　　ویسے ہی اے حریص رہے اشتہائے حرص
توڑوں جو اپنے پائے طلب فائدہ نہیں　　تدبیر وہ کروں کہ شکستہ ہو پائے حرص
ہے کشتیِ نجات قناعت ہی عاقلو!　　ڈوبیں گے بحرِ غم میں جو ہیں آشنائے حرص

جس طرح بعد سفیدی کے نہوں بال سیاہ　(۴)　ہو الٰہی نہ مرا نامۂ اعمال سیاہ
دن سیاہ رات سیاہ ماہ سیاہ سال سیاہ　　دل سیہ بخت سیہ نامۂ اعمال سیاہ
وہ سیہ بخت ہوں گر سایہ فگن ہو مجھ پر　　سایہ کی طرح تمہارے ہوں پرِ بال سیاہ
آج عالم مجھے تاریک نظر آتا ہے　　ہو گیا آہ مرا کوکبِ اقبال سیاہ
عید غربت میں ہوئی ہو گئی دنیا تاریک　　ہے محرم کی طرح غرۂ شوال سیاہ
اپنے ہی روزِ سیہ سے نہیں واقف ناسخ　　کیوں کیا کرتے ہیں کاغذ کو یہ بقال سیاہ

ہمارا ہر نفس ایک بادباں ہے　(۵)　روانہ کشتیِ عمرِ رواں ہے
تنِ خاکی میں قدر اپنی نہاں ہے　　زمیں جیسے حجابِ آسماں ہے
کروں کیا احتیاطِ جسمِ خاکی　　غبارِ توسنِ عمرِ رواں ہے
کیا ہے آگ سے مچھلی کو پیدا　　یہ اعجازِ کفِ رنگیں عیاں ہے
زمیں واژوں ہے اپنا کوکبِ بخت　　زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے
بحمد اللہ مرا ممدوح ناسخ　　جگر بندِ امامِ انس و جاں ہے

میر تقی میر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار (۱) کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار
خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
ہے مثل مشہور یہ عمرِ سفر کوتاہ ہے طالعِ برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امدادِ کار
خوش نوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش جن کو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
کام کے جو لوگ صاحبِ فن ہیں سو محسود ہیں بے تہی کرتے رہیں گے حاسدانِ نابکار
بس قلم رکھ ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرفِ میرؔ کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار

دل رفتۂ جمالِ ہے ابنِ ذوالجلال کا (۲) مستجمعِ جمیعِ صفات و کمال کا
ادراک کو ہے ذاتِ مقدس میں دخل کیا اودھر نہیں گزار گمان و خیال کا
ہے قسمتِ زمین و فلک سے غرض نمود جلوہ وگرنہ سب میں ہے اس کے جمال کا
مرنے کا بھی خیال ہے میرؔ اگر تجھے ہے اشتیاق جانِ جہاں کے وصال کا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے (۳) یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا؟
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

لاکھوں فلک کی آنکھیں سب مند گئیں ادھر سے (۴) نکلی نہ ناامیدی کیوں کر مری نظر سے
جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے دیکھا نہ ان کو اب کی آئے جو ہم سفر سے
جھڑ باندھنے کا ہم بھی دینگے دکھا تماشا ٹک ابرِ قبلہ آکر آگے ہمارے برسے

مرزا محمد رفیع سودا

(۱)

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر — لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
غافل غضب سے ہو کے کرم پہ نظر نہ رکھ — پُر ہے شرار برق سے دامن سحاب کا
قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم کا — دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا
سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور — جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

---

(۲)

کام آیا نہ کچھ اپنا تن زار آخر کار — سمجھے اکسیر تھے نکلا یہ غبار آخر کار
باغباں تھا تجھے دو دن کی ہوا پر یہ غرور — نہ ہے باغ میں گل رہ گئے خار آخر کار

---

(۳)

زباں دہن میں تو غنچے کے بھی ہے کیا لازم — کہ جس کے منہ میں زباں ہو سخنوری جانے
امور ملک میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم — گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل میں جس دم سریر آرا ہو — ہر ایک خرد و کلاں میں برابری جانے
وہی ہو رائے مبارک میں اس کے گوشہ نشیں — کہ جس میں عامۂ خلقت کی بہتری جانے
ملازموں میں سے لاوے اسے نہ بر سر کار — کہ جس سے کار خلائق کی بہتری جانے
چمن ہے ملک و رعیت ہے گل انھوں کے لئے — بسان ابر بسر سایہ گستری جانے
غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا — کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوری جانے

---

(۴)

کروں چمن میں اگر جا کے میں غزل خوانی — تو بلبلیں ہوں مرے چہچہے کی دیوانی
نہال ہووے سخن کا اگر یہ کھینچے قد — برنگ سایہ پڑے پاؤں سرو بستانی
کرے طلوع اگر مہر فکر کا میرے — نہ آفتاب میں ذرہ ہے زرخشانی

ہوا نہیں وہ مرے چست شعر کو سن کر — زمیں میں شرم سے اب گڑ گیا ہے خاقانی
مری یہ فکرِ سخن صفحۂ زمانہ پر — کرے ہے مدح و مذمت میں جوہر افزانی

ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا — پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا
تا صاف کرے دل نہ مئے صاف سے صوفی — کچھ سود صفا علمِ تصوّف نہیں کرتا
دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے — دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا
کچھ اور گماں دل میں نہ گزرے ترے کافر — یا داس لئے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

---

(۲)

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب — کام چور اس کام پر کس منہ سے اُجرت کی طلب
ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا — ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب
جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے — کاسۂ زہر آب سے کرتا ہے شربت کی طلب
بطنِ مادر ہی سے جب پیدا ہوا تکلیف سے — یاں کہاں راحت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب
گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار — کر کشادِ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

---

(۳)

گر آب کی پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے
سرمایۂ اُمید ہے کیا پاس ہمارے — اک آہ ہے سینے میں سو نومید اثر سے
وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں — ہے شاخِ ثمر دار میں گل پہلے ثمر سے
اشکوں میں بہے جاتے ہیں ہم جانبِ دریا — مقصود رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے
اُف گرمیِ وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں — پتھر ہیں پہاڑوں کے اُڑے جاتے شرر سے

کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ — کیا جانے کہ آ جائے ہے تو اس میں کدھر سے
اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے (۴) سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

نہیں ثبات بلندیِ عزّ و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
حجر کے چومنے ہی پر ہے حج کعبہ اگر — تو بوسے ہم نے بھی اُس سنگِ آستاں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
جو پاسِ مہر و محبّت کہیں یہاں بکتا — تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا — کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے (۵) اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے — تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدّر دونوں — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت — تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار — نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے
نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش — دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے
کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ — جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

مرزا اسداللہ خاں غالب

قطعہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو (۱) ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا ایک گھر بنانا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ (۲) کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے
خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن ق — شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم — تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بازیچۂ اطفال ہی دنیا مرے آگے (۳) ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے
ایک کھیل ہی اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — ایک بات ہی اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہی نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہی جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہی میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۴)

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے — جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہئے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھئے — کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہئے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے — روانیِ روش و مستیِ ادا کہئے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہئے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

---

(۵)

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب — شاہِ دیندار نے شفا پائی

---

(۶)

قطعہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(۷)

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر مانیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

(۸)

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

(۹)

قطعہ

اے شاہِ جہاں گیر جہاں بخش جہاں دار — ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو — تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر — گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے تجارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا — ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں — تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی — باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل — ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر — قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں — نظارگی صنعت حق اہل بصارت
تم کو شرف مہر جہاں تاب مبارک — غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

مولوی امیر احمد امیر مینائی

(۱)

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع — عرصۂ کارزار ہے دنیا
اہل رغبت سے کرتی ہے نفرت — بڑی پرہیزگار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار — سخت ناپائدار ہے دنیا
بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر — دیکھنے کو بہار ہے دنیا

---

(۲)

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا — کہ ذرہ ذرہ ہے آئینہ خودنمائی کا
فقیر اس کی گلی کا ہوں میں عجب کیا ہے — جو تاج شاہ ہو کاسہ مری گدائی کا
رہ طلب میں ادب ہی سے سرفرازی ہے — مزہ کلیم سے پوچھو برہنہ پائی کا

خدا خدا جو کرے اور خودی کا دم بھی بھرے　　بڑا فریبی ہے جھوٹا ہے وہ خدائی کا
بشر سے حمدِ الٰہی امیرؔ کیا ممکن　　پہاڑ اٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

حالِ فنائے دہر سے غافل نہیں حباب (۳) ہر دم کو جانتا ہے دمِ واپسیں حباب
دیتا ہے بے ثباتیِ افلاک کی خبر　　جامِ جہاں نما سے ہیں کم نہیں حباب
پہچانتے ہیں خوب جو ہیں معنی آشنا　　دنیا ہے نقشِ آب سپہر بریں حباب
ہے پانی پانی آنکھ اٹھاتا نہیں امیرؔ　　کیا میری چشمِ تر سے ہوا شرمگیں حباب

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے (۴) کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ　　سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے
تو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں　　کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی　　میزباں تو ہے میہماں تو ہے
نہ مکاں میں نہ لامکاں میں کچھ　　جلوہ فرما یہاں وہاں تو ہے
رنگ تیرا چمن میں بو تیری　　خوب دیکھا تو باغباں تو ہے
محرمِ راز تو بہت ہیں امیرؔ　　جس کو کہتے ہیں راز داں تو ہے

سراج الدین محمد شاہ ظفر

آکے پروانہ ہی کیا اس بزم میں جل بھن گیا (۱) شمع بھی یہاں رو گئی شعلہ بھی یاں سر دھن گیا
نام اس کا رہ گیا بس جس کا گن باقی رہا　　ورنہ جو یاں سے گیا ساتھ اس کے اس کا گن گیا
میں صبا وہ طائرِ بے طاقت اس گلشن میں ہوں　　ایک پر جس کا نہ اڑ کر تا سرِ گلبن گیا
واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشو و نما　　سبز ہو سکتا نہیں وہ جو کہ دانہ گھن گیا

جاگ اٹھا خوابِ عدم سے یک بیک سارا جہاں — کان میں جس دم ظفرؔ خالق کا امرِ کن گیا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیئے نہ تاج شاہانہ (۲) مجھے تو ہوش دے اتنا کہ ہوں میں تجھ پہ دیوانہ
کتابوں میں دھرا کیا ہے بہت لکھ لکھ کے دھو ڈالیں — ہمارے دل پہ نقش کالحجر ہے تیرا فرمانا
نہ دیکھا وہ کہیں جلوہ جو دیکھا خانۂ دل میں — بہت مسجد میں سر مارا بہت سا ڈھونڈا بتخانہ
یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر — اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر آنا نہ پھر جانا

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ (۳) اس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ
کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تونگر — از بہر نشاں - لیک نشاں بعد فنا ہیچ
ایماں کو نہ دے ہاتھ سے غافل کہ پس مرگ — آنے کا نہیں کام ترے اس کے سوا ہیچ

نہیں تم کو لازم برائی کی باتیں (۴) بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں
غضب ہے کہ دل میں تو رکھو کدورت — کرو منہ پہ ہم سے صفائی کی باتیں
اگر سیدھے ہوتے مرے بختِ وارون — تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں
ظفرؔ کیا زمانہ برا آ گیا ہے — جہاں دیکھو ہیں واں برائی کی باتیں

دل پہ گر یہ ٹھنی ٹھنی اچھی (۵) ہے جہاں میں فروتنی اچھی
روغنِ قاز مل کے چرب زباں — بات کرتے ہیں روغنی اچھی
نہیں ناداں کی دوستی بہتر — بلکہ دانا کی دشمنی اچھی

۱۱

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا
کیا لطفِ مقام ان کو جو مشتاقِ عدم ہیں دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا
کیا بھیجئے قاصد کو وہاں کوچہ میں جس کے جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا
تربت پہ مری برگِ گلِ تازہ چڑھائے احسان ہے مجھ پر یہ نسیم سحری کا
بندہ ہے ترا مصحفیِ خستہ کو یارب محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا (۲) اپنے رہنے کو مکاں چاہیئے تنہائی کا
شیشۂ دل کو مرے چور کیا کیوں اس نے کیا بگاڑا تھا بھلا گنبدِ مینائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا
مصحفی ریختہ پہنچا مرا کس رتبہ کو شوریاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ (۳) شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں
یہ درمیاں جو ہمیں نوں بگاڑ رہتا ہے وہی شریر نہیں کچھ شریر ہم بھی ہیں
حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام ان کا کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

خامش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے (۴) دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے
باندھے ہوئے ہاتھوں کو بہ اُمیدِ اجابت رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے
سمجھوں ہوں اسے مہرۂ بازیچۂ اطفال کس کام کا ہے گنبدِ گردوں مرے آگے
سب خوشہ ربا ہیں مرے خرمن کے [illegible] کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

اُستاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں ہے کودکِ نو درس فلاطوں مرے آگے

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ

(۱)

برنگِ بوئے گل ہے ہر نفس یادِ الٰہی میں قیامت تک بھرے گی دم نسیم صبحدم میرا
سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر اک نقشِ قدم میرا
الٰہی کعبۂ تسلیم میں یوں باریابی ہو بڑھے لبیک کہہ کر پیشتر سب سے قدم میرا
مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا ستم میرا
تری بندہ نوازی ہفت کشور بخش دیتی ہے جو تو میرا ۔ جہاں میرا، عرب میرا عجم میرا
فنا فی اللہ ہو کر پاؤں عمرِ جاوداں ایسی مسیح و خضر کی ہستی سے بڑھکر ہو عدم میرا
جلوں گا حشر تک اے داغ میں سوزِ محبت میں نہ دے گی ساتھ تا روزِ جزا شمعِ حرم میرا

---

(۲)

وہی دوست ہیں وہی آشنا وہی آسماں ہے وہی زمیں
عجب اتفاقِ زمانہ ہے کہ بشر نہیں ہے بشر سے خوش
مجھے چشمِ تر سے نہیں گلہ مرے دل کا داغ مٹا دیا
کہ کہا ہے نورِ بصر اگر تو گیا ہے لختِ جگر سے خوش
مجھے تجھ سے شکوہ ہے اے فلک کبھی تو نے میری خوشی نہ کی
کوئی یہ بھی کام میں کام ہے جو کبھی ہو اہلِ ہنر سے خوش

---

(۳)

نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ بس اب خانہ آباد دولت زیادہ
محبت میں سو لطف دیکھے ہیں لیکن مزہ دے گئی ہے شکایت زیادہ

الٰہی زمانہ کو کیا ہوگیا ہے — محبت تو کم ہے عداوت زیادہ
عدم سے سب آئے ہیں یاں چار دن کو — نہیں ہوتی منظور رخصت زیادہ

---

(۴)

کچھ تعلق رہا نہ دنیا سے — شغل ایسا بتا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدعا دیا تو نے
عمرِ جاوید خضر کو بخشی — آبِ حیواں پلا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اُس سے مجھکو سوا دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تو نے
داغؔ کا کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

آم

(۵)

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں — بحرِ عطا کیا ہی ہوا موجزن
کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ — داغؔ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
زرد ہیں ہے رنگِ گلِ زعفراں — کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
طوطا پری، لال دیا، دل پسند — کہتے ہیں نام انھیں اہلِ دکن
آم ہرا جامِ زمرد کی شکل — لال دیا صورتِ لعلِ یمن
سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ — مُنھ پہ اگر اُن کے ہو مشکِ ختن
گر کبھی اِن آموں کا رس چوس لیں — ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن
انبۂ شیریں جو اسے ہو نصیب — نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن
یہ ہی تو ہیں جنتِ دنیا کے آم — اِن کا ہی مصلح ہے بہشتی لگن

سیکڑوں قسمیں اسی میوہ کی ہیں — پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہی من
واقعی اِن آموں کی تعریف میں — کم ہے جہاں تک کہیں اہلِ سخن
قاش بنے اس کی جو اپنی زباں — قند کا کوزہ بنے اپنا دہن
دیکھئے شیرینیِ گفتار پھر — نطق بھی چپکے دمِ عرضِ سخن
پھولے پھلے شاہ کا باغِ مراد — اور ثمریاب ہوں اہلِ زمن
فیض رساں داغ کو یارب رہے — خسروِ محبوب نظامِ دکن

مولوی محمد شبلی

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے نشان چھوڑا نہ ہر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

بھلی تھی تقدیر یا بُری تھی یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کئے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

یہ نظم آئیں یہ طرزِ بندش سخنوری ہے فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا

پھینک شیشے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمرِ گزشتہ کی تلافی کر لوں
کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں
جورِ گردوں سے جو مرنے کی بھی فرصت مل جائے — امتحانِ دمِ جاں پرورِ عیسی کر لوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی — خوب گزرے فلکِ دوں سے جو یاری کر لوں

(حضرت اکبر الٰہ آبادی کے رقعۂ دعوت کا جواب)

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال (۳) لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

نالۂ شبلی

وہ بھی تھا ایک دن کہ یہ وحشت سرائے دل (۴) اک محشرِ نشاط و فورِ سرور تھا
رنگینیِ خیال سے لبریز تھا دماغ جو شعر تھا چراغِ شبستانِ حور تھا
سینہ میں تھا چمن کدۂ صد امیدِ نو آنکھوں میں کیفِ بادۂ ناز و غرور تھا
ایک ایک برگ تھا ورقِ نوبہارِ حسن ذروں کے رخ پہ صبحِ سعادت کا نور تھا

نظر آتا نہیں اب صبر کا پہلو مجھکو (۵) کام دیتی نہیں کچھ قوتِ بازو مجھکو
شہر ویرانہ نظر آتا ہے ہر سو مجھکو ہائے افسوس کہاں چھوڑ گیا تو مجھکو
جب وہ گنجینۂ امید و تمنا نہ رہا
ایک بے کار زمانہ میں رہا یا نہ رہا
انتقالِ پدرِ پیر بھی دیکھا میں نے ماتمِ مادرِ دلگیر بھی دیکھا میں نے
صدمۂ رحلتِ ہمشیر بھی دیکھا میں نے دو برادر کو جواں میر بھی دیکھا میں نے
یہ نمائش کدۂ داغِ عزیزاں تو نہیں
میرا سینہ ہے الٰہی یہ چراغاں تو نہیں

مولوی اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی

کیوں کبر و غرور اس دور میں ہے کیوں دستِ فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا

بدلی وہ ہوا گزرا وہ سماں وہ راہ نہیں وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے ابلنا چھوڑ دیا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

دو تیتریاں

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں
اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی خوش رنگ چست نازک پیاری
پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار
تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم

گو تابعِ جوششِ پروازی ہیں
دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں

کیوں کر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے — اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گر اسکول کہاں — فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
اس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے — دامانِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

افاداتِ نمائش

محنت و صنعتِ انساں کا چمن ہے تو یہ ہے — علم اور عقل کا گر انگیز نشیمن ہے تو یہ ہے
ذہن سے حضرتِ ہیوٹ کے یہ نقشہ نکلا — اک جہاں آپ کی تجویز کا شیدا نکلا
مرکزِ چشمِ تماشائے جہاں ہے یہ مقام — ہر جگہ آج کے دن وردِ زباں ہے یہ مقام
برکتیں عمدہ برٹش کی نمایاں ہیں یہاں — راحتِ زیست کے ہر طرح سے ساماں ہیں یہاں
جتنے صنّاع ہیں سب کے لئے اک جانچ ہے یہ — گرم بازاریِ دنیا کے لئے آنچ ہے یہ
اس کے ہیں سکرٹری شہرۂ آفاق مُرے — ان کی محنت کی کہاں تک کوئی تعریف کرے

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی

بدلے گا اب بہار سے قطعاً خزاں کا رنگ — حاکم ہوئے ہیں صوبہ کے سر میکورتھ ینگ
کیا حسنِ انتظام ہے بسمارک بھی اگر — جرمن سے آکے دیکھے تو ہو جائے عقل دنگ
ایک نصف درجن آنکھوں سے گزرے ہیں لفٹننٹ — پر ان کے انتظام کے بالکل نئے ہیں ڈھنگ
انصاف اس کو کہتے ہیں عدل اس کا نام ہے — اک گھاٹ پانی پیتے ہیں بزغالہ و پلنگ
ہیبت تمہاری لشکرِ اعدا کو دے شکست — ظاہر کا ایک حیلہ ہے کیا توپ کیا تفنگ
منظور ہو جسے کہ ہو ہر طرح کامیاب — بس تم سے آکے سیکھ لے تدبیرِ صلح و جنگ
قائل نہ تھے کسی کے مگر تم کو دیکھ کر — ہم ہو گئے ہیں معتقدِ دانشِ فرنگ
اب لے کے تم کو حاکمِ پنجاب خوش ہوئے — تھے اس سے پہلے اہلِ ہنر زندگی سے تنگ

مجھکو ملا خطاب تو ہے مجھکو اس سے فخر — گو ہے خطاب کو مری نسبت سے عار و ننگ
ہر چند ہوں کمالِ فضیلت سے بے نصیب — پر شکر ہے کہ طبع میں جودت ہے اور آہنگ
کہتا نہیں گر مجھے قدرت ہے نظم پر — لیکن نہیں ہوں دوسروں کی طرح سے بے ڈھنگ
لوہا نہیں ہے ذہن کی تلوار کا خراب — ہاں بے مہارتی کے سبب سے چڑھا ہے زنگ
الماس ہے نتیجۂ فیضانِ تربیت — ہے ورنہ اصل وضع میں اس کی سرشت سنگ
تم پرورش کرو تو کرے مات برق کو — عند السباق سرعتِ رفتارِ اسپِ لنگ
عہدِ حکومت آپ کا یوں ہو مفیدِ ملک — سیراب جیسے کرتا ہے کھیتوں کو آبِ گنگ

قصائد

حکیم مومن خاں مومن

حمد

الحمد لواہب العطایا — اس شور نے کیا مزہ چکھایا
والشکر لصانعِ البرایا — جس نے ہمیں آدمی بنایا
کیا پایۂ منتِ سلیمانؑ — اک بات میں تخت پر بٹھایا
کیوں شکر کریں نہ آلِ داؤدؑ — افسونِ شہنشہی سکھایا
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو — پایا ہر شے میں پر نہ پایا
اللہ رے تیری بے نیازی — یعقوبؑ کو مدتوں رلایا
یوسفؑ سے عزیز کو کئی سال — زندانِ عزیز میں پھنسایا
یاں شعلے کو سرکشی کی کیا تاب — ابلیس کو خاک میں ملایا
تجھکو ہی سزا ہے کبریائی — کرسی کا نہ عرش کا یہ پایا
یاں تاب کسے کہ خاک و خوں میں — بیتابیِ شوق نے لٹایا

عظمت نے سجود کی فلک کو — گردِ کرۂ زمیں پھرایا

آدے ترے حمد کا تو ہم — یہ حوصلہ میں کہاں سے لایا

کیا جانئے ایسے بے زباں نے — کس طرح یہ شور و غل مچایا

معلوم خرد کی نکتہ یابی — یاں علم نے عقل کو گنوایا

کیا صعب گزار ہے رہِ قہر — جبریل کا پاؤں لڑکھڑایا

چکر میں ہے عقلِ عرشِ اعظم — اس نے بھی مگر تجھے نہ پایا

مرغانِ دراز اجنحہ کو — اس اوج نے خاک پر گرایا

میں روح قدس کا ہمزباں ہوں — یہ مرتبہ عجز نے بڑھایا

کیوں کر نہ ہو تیری آس تو نے — یوسفؑ کو گناہ سے بچایا

وہ رفعتِ حال دی کہ جس نے — منصور کو دار پر چڑھایا

اس کا مرے دل پہ ایک پرتو — جس شعلہ نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حالِ آخر — ہے کون ترے سوا خدایا

گزارش

از مرزا غالب

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجکو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھکو نہیں — ذوق آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھسا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنئے — ہے زباں میری تیغ جوہردار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میرا ابر گوہربار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تبریک عید

(از مرزا غالب)

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہی سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھسے کیوں چھپاتا ہی — مجھکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہی اُمید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہی حلقہ بگوش — غالب اس کا مگر نہیں ہی غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
تجھکو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریبِ عید ماہِ صیام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھکو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے　　اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص　　گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھکو فرِّ فروغ　　کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی　　کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　کوئے و مشکوئے صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز　　اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ　　اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلال والاکرام

انقلابِ زمانہ

(از مومن)

یادِ ایامِ عشرتِ فانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں　　کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی　　ہائے کیسی بلند ایوانی
کر دیا گردشِ سپہر نے حیف　　برج خاکی منیرِ کیوانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون　　بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں　　کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار　　کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
جائے گل ہے چمن میں ریزۂ سنگ　　کاہ کرتی ہے نازِ ریحانی
اٹ گئے حوض و نہر غیر از چشم　　ایک قطرہ کہیں نہیں پانی

نہ ملا کچھ نشانِ آب و ال　　خاک سارے جہان کی چھانی

سقفِ رنگین و زرنگار کہاں　　جز سپہر و نجوم نورانی

شورِ زاغ و زغن ہی سمع خراش　　اب کہاں بلبل و غزل خوانی

نظر آتی نہیں وہ تصویریں　　نقش دیوار کیوں نہ ہو مانی

صرف دلقِ گدا ہوئے پردے　　زینت افزائے کاخِ سلطانی

آب کاشانہ فرشِ خاک ہوا　　کیسے قالیچہ ہائے کاشانی

یا ظروف و سماط سے مجھے تھا　　دعوئے قیصری و خاقانی

یا نہیں ہے مرقع و کشکول　　تا کروں تازہ رسمِ ساسانی

مسندِ گوہریں کا دھیان آیا　　پوچھتے کیا ہو وجہ گریانی

بالشِ سنگ و خواب و واویلا　　بار خاطر ہوئی گراں جانی

یا یہاں پرنیاں و اطلس سے　　جلوہ گر تھی سپہر سامانی

یا یہ احوال ہے کہ چاک ہوا　　تنگیوں سے لباسِ عریانی

کیا کہوں اپنی گردشِ ایام　　صبح نوروز ہی شبستانی

اس چمن زار کو خزاں بھی ضرور　　میں نے کیا تھی کی بات پہچانی

کر دیا خالقِ دو عالم نے　　امتیازِ ریاضِ رضوانی

ہائے وہ ساز و برگ و عیش و نشاط　　قوت افزائے روحِ انسانی

تیر بارانِ فاقہ نے مارا　　بک چکی تھی کلاہِ بارانی

پنبۂ داغ دل کو حیراں ہوں　　نہ رہا خرقۂ زمستانی

ایک دن یوں ہجومِ یاراں تھا　　جیسے اب مجمعِ پریشانی

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے　　ذرۂ خورشید کی درخشانی

بے زری سے مری تجھے حاصل　　کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی

تہنیتِ عید اضحیٰ

از شیخ محمد ابراہیم ذوق

نطق شیریں ترا وہ ہے کہ ثنا میں اُس کی ۔۔۔ تر زباں موجۂ دریا ہو اگر ایک زماں
آبِ دریا میں ہو یہ جوشِ حلاوت پیدا ۔۔۔ لبِ دریا بھی بہم ہو کے ہوں دونوں چسپاں
اس قدر تابعِ فرماں ہے زمانہ تیرا ۔۔۔ ہو نہ گلشن میں بھی روئیدہ گلِ نافرماں
وہ ترا زورِ حمایت ہے کہ جس کے باعث ۔۔۔ ناتوانوں کو بھی ہے دہر میں یہ تابِ تواں
ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں ۔۔۔ ایک تارِ نگہِ مور سے سو پیل دماں
پیل تیرا گلِ سوسن کا بڑا اک انبار ۔۔۔ گلِ مہتاب کے گلدستے ہیں اس کے دنداں
اُس کی خرطوم کسی دلبرِ لیلیٰ وش کی ۔۔۔ جعدِ مشکیں ہے کہ ہے کاکلِ عنبر افشاں
لکھوں شوخی جو ترے توسنِ چالاک کی میں ۔۔۔ اشہبِ خامہ بھی ہو موجِ رمِ برق جہاں
وقت کاوے کے دمِ معرکہ راکب اُس کا ۔۔۔ سرِ حاسد کو رکھے صورتِ گوئے چوگاں
اے فلک ماہ ترے در کے ہیں وہ ذرّہ خاک ۔۔۔ جن سے خورشید چنے اپنی جبیں پر افشاں
طبعِ رنگیں میں ترے وہ چمنِ لالہ و گل ۔۔۔ روبرو جس کے ہے گلزارِ ارم خارستاں
عید اضحیٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے ۔۔۔ تجھ پہ ہو سایۂ حق اور ترے سایہ میں جہاں
ترے ہاتھوں سے کماں ہو جو سعادت اندوز ۔۔۔ کیا تعجب ہے کہ ہو رشکِ ہما زاغِ کماں
قہر نازل ہو فلک سے جو ترے اعدا پر ۔۔۔ چشمۂ مہر ہو مانندِ تنورِ طوفاں
اس طرح عدل سے ہے تیرے بہم آتش آب ۔۔۔ جس طرح آئینہ میں عکسِ رخِ شعلہ رخاں
تیرے احساں سے ہر انساں ہے غلامی میں ترے ۔۔۔ سچ کہا ہے کہ الانسان عبید الاحسان
دل میں ہے جوشِ مضامیں تو نہایت لیکن ۔۔۔ دل حوادث سے زمانے کے ہے بے تاب و تواں
ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیرے ۔۔۔ کیا لکھے وہ ترے اوصاف کہ قاصر ہے زباں

قصیدہ

از ذوق

عکس سے نیّرِ اقبال کے دریا میں ترے
اے محیطِ کرم و جود کے یکتا گوہر

طبعِ نازک پہ ترے بارِ گہر ہو جو گراں
پوستِ بیضۂ ماہی سے ہو ہلکا گوہر

آج محفل میں ترے وہ گہر افشانی ہے
لگنِ شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر

دستِ فراش میں جاروب ہے ریشِ فرعون
فرش پر تیلیوں میں اُلجھے جو صدہا گوہر

تیرے دورانِ حفاظت میں کہاں رنج و گزند
حق میں بیمار کے تبخالہ ہے لب کا گوہر

سینہ صافی کا ترے ایک ہے نقشہ دریا
دلِ روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر

نقرۂ خنگ ترا ایسا بہ رنگِ شفاف
روبرو جس کی صفائی کے ہو میلا گوہر

پیل تیرا ہے بلندی میں فلک سے افزوں
جھول میں جس کے ہیں انجم سے زیادہ گوہر

لگے خرطوم میں جو آب ہو وہ قطرہ فشاں
دیوے جوں ابرِ بہاراں ابھی برسا گوہر

تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانہ کے
مہرۂ پشت سے دشمن کے ہے چُنتا گوہر

شعلۂ برقِ غضب سے ترے شاہا تہِ آب
مثلِ مریخ ہر اک سرخ ستارا گوہر

مہرواروں میں ترے ایک ہے ناچیز عقیق
آبداروں میں ترے ایک ہے ادنیٰ گوہر

ہو ترا کلکِ کرم جب کہ شہا گوہر بار
جیم محتاج کے دامن میں ہو نقطا گوہر

نقطۂ قافِ قلم سے جو ہو تیرے ہمسر
قاف تک قاف سے ہو بیضۂ عنقا گوہر

سینہ صافی سے ترے ہووے صفا ایسی عام
دل کافر میں بھی ہو خالِ سویدا گوہر

خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصافِ نکو
تو سدا منہ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر

ذوق کرتا ہے دعائیہ پہ ختم سخن
تاکہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

قصیدہ

امیر مینائی

فصلِ گل آئی ہوا گلزارِ جنت بوستاں
بڑھ کے رضواں سے ہوا اِن روزوں دماغِ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے
جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں
قُم باذنِ اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اُٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں
رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آکر دیکھ لیں
صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں
لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست
نرگسِ شہلا نے رکھی مے فروشی کی دکاں
داربستِ تاک میں خوشے نظر آنے لگے
جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں

سیمِ غنچہ کیوں نہ بے حد ہو زرِ گل بے شمار
رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں

ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرمی
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں

فیضِ شبنم نے دیئے اشجار کو آبی لباس
بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں

نو عروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق
بیچنے فیروزہ آیا ہے چمن میں باغباں

یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسینِ دامن کشاں

ہے مبارک فال کوئی آنے والی ہی خوشی
ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہی گل فشاں

جان پھولوں میں پڑی زندہ ہوئی خاکِ چمن
ہے دمِ جاں بخش عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

قمریوں کا قول ہے ہم ہیں طیورِ باغِ خلد
سرو کہتا ہے کہ ہوں میں طوبیٰ باغِ جناں

صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہی یہ رنگ
مرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر کہاں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ پر
ہے محیطِ مشرق و مغرب برنگِ کہکشاں

پائے گر سورج ٹکھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ
بھول جائے مہر جنبش مثلِ قطبِ آسماں

چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب سے ہے فرشِ فضائے بوستاں
سیر کو جو آئے اُس کا نافِ آہو ہو مشام
گیسوئے مشکینِ سُنبل بس کہ ہے عنبر فشاں
دیدۂ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے
خواب میں کرتا ہے سبزہ سیرِ گلزارِ جناں
ہے تبسّم غنچۂ گُل کا کہ تیغِ آب دار
نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبھوتے ہیں سناں

قصیدۂ دعائیہ

ذوق

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطانِ خاور ہو
قمر دستورِ اعظم صدرِ اعلیٰ سعدِ اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میرِ عمارت ترکِ گردوں میر لشکر ہو
سرِ ہفت آسماں جب تک کہ دَورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو
رہے نامِ سلیمان تا نگینِ حکمرانی سے
رہے نامِ فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے
سکندر تا ہو نامی سکّۂ کشورستانی سے
ترا اے خسروِ والا حشم عالم مسخّر ہو
سریرِ سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخارارض سے تا ابر ہوا اور ابر میں پانی،
رواں پانی سے تا دریا ہوا اور دریا سے طغیانی
زمیں میں تا ہو کاں اور کان میں ہو جوہرِ کانی
ہے جوہر ہو قیمت اور قیمت میں فراوانی
تری شمشیرِ جوہردار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحرِ پُر گہر ہو کانِ پُر زر ہو
رکھیں تا عود کو آتش میں اور آتش کو مجمر میں
گلِ ترتا ہو گلداں میں تری ہو تا گلِ تر میں
رہے نافہ میں مشک اذفر اور بو مشک اذفر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور رہو تا آب گوہر میں
ترے ابرِ کرم سے باغِ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو
طریقِ رہبری میں خضر ہو جب تک ہدایت فن
سہارا ہووے تا بحرِ غریقِ الیاس کا دامن
رہے ادریس تا قطعِ تعلق سے جناں مسکن
مسیحا کا ہو با لاخانہ تا خورشید سے روشن
چراغِ عمر سے تیری جہاں سارا منوّر ہو
فروغِ اسلام کو ہو رونقِ دینِ پیمبر ہو
شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
ثریّا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو
کرے وسمے سے تا قوسِ قزح سبز اپنے ابرو کو

لب پاں خوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیری انگشتِ سناں پر ہو

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا
نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نہالِ تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا
نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جب تک نشاط افزا
شرابِ عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشنِ جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آگیں
قلم زن تا ہو مشک افشاں کا غذ خطا سے مشک آگیں
زباں پر تا سخن ہو اور سخن میں معنیٔ رنگیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہلِ سخن تحسیں
ترا مدّاح دایم خسرو ذوقِ سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دُعا گو ہو ثنا گر ہو

حمد

حالی

رہیں وشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا

نہ جی دکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یاں اُنھیں بھی امیدوار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اُس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُرخطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

رہا ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے۔
گُل اُن کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ کون ہے اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اِک استوار دیکھا

سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہو یا مسلماں
نہ اُن سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اُن سے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھا یاں اختیار سب کچھ انھیں بھی سب بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

سہرے

نواب زینت محل کو بادشاہ (بہادر شاہ) کے مزاج میں بہت دخل تھا مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے مرزا نے سہرا کہہ کر حضور میں گزارا۔ مقطع سُن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد اور ملک الشعراء بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرف داری ہے۔ چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم (شیخ ابراہیم ذوق) جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے دیکھئے انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے فرمایا اُستاد تم بھی ایک سہرا کہہ دو عرض کی بہت خوب پھر فرمایا ابھی لکھ دو ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

(آبِ حیات)

(از غالبؔ)

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حُسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا ممبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرّر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے　　گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک　　کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار　　لائے گا تاب گرانباریٔ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں　　دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

(از ذوق)

اے جواں بخت مبارک ترے سر پر سہرا　　آج ہے یمن سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک　　کشتیٔ زر میں مہِ نو کے لگا کر سہرا
تابشِ حُسن سے مانند شعاعِ خورشید　　رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا
وہ کہے صلِّ علٰی یہ کہے سبحان اللہ　　دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تا بنے اور ہی میں رہے اخلاص باہم　　گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی　　گائیں مُرغانِ نوا سنج نہ کیوں کر سہرا
رشتۂ فرّخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار　　تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش　　سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
اک گُہر بھی نہیں صد کان گُہر میں چھوڑا　　تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار　　اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طُرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّی　　کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک　　کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے اُٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے　　دمِ نظّارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا　　واسطے تیرے ترا ذوقؔ ثنا گر سہرا
جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دے اُس کو　　دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

بے ثباتی دنیا

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

فروتنی

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

رحم و انصاف

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کے دوزخ میں جلا وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

موت کی تمنا

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

خلق کی تعریف

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے جو خلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی اسد سمجھے جو برا آپ کو اچھا وہ ہے

سرمایۂ علم

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

احسان بے منت

احسان کی ہے گر صلہ کی خواہش تم کو تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں کر دو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اسے عام اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا مجھ سے ہی عزت ہی جہاں ۔ فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی۔ غلط ہی دونوں کا بیاں ۔ میں بھید ہوں حق کا جو ہی نیکی میں نہاں

خدا کی یاد

طوفان میں ہی جب جہاز چکر کھاتا ۔ جب قافلہ وادی میں ہی سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہی جب اُٹھ جاتا ۔ واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

گھر کی رخصت

گھر کھُدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے ۔ روتی ہی لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر ۔ یا گھر ہوتا ہی آج رخصت ہم سے

رضائے الٰہی

دین اور دنیا کا تفرقہ ہے مہمل ۔ نیت پہ ہی موقوف ہی تنقیح عمل
دنیا داری بھی عین دین داری ہے ۔ مرکوز ہو گر رضائے حق عز و جل

اشعار بلحاظ مضمون

استقلال

پائے استقلال ثابت چاہیئے ۔ کر سکے گی گردش افلاک کیا
پھر بھی ارنی پکاروں موسیٰ ۔ سو بار گروں جو میں غش کھا کر

حرص

منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے ۔ گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا
حرص و ہوا کو سینہ میں غافل جگہ نہ دے ۔ مطلب کو فوت کرتا ہے کیڑا کتاب کا

بحرِ غم میں ڈوبیں گے جو ہیں آشنائے حرص ؎ ہے کشتیِ نجات قناعت ہی غافلو!

حسد

رنجِ حسد ہی جان ہے جب تک کہ جان میں ؎ حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں

کینہ

جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا ؎ انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا

عزت

اس وقت میں آبرو بہت ہے ؎ کیا غم ہے امیر اگر نہیں مال

رحمتِ الٰہی

دوزخ میں مجھ کو جھونک چکے تھے مرے عمل
قربان شانِ رحمتِ پروردگار کے
جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو درِ یگانہ بنا

مری بندگی سے مرے جرم افزوں ؎ ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری ادھر ؎ یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

نزول اس کی رحمت کا ہے ہم پہ ہمیشہ ؎ جو کہتا وہ خود آپ لا تقنطو کا

خُلق

وہ خُلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں ؎ ہے شاخِ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

خوش امیر وہ منعم کہ ہو کے دولت مند
جھکائے سر شجرِ میوہ دار کی صورت
خاکساری سے نہیں بہتر جہاں میں منعمی
مل گئی جس کو یہ دولت کیمیا گر ہو گیا

راستی و صاف گوئی

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے ؎ عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

بات جو منھ سے کہو دل کو ذرا لگتی کہو ؎ مت کہو رو و رعایت سے خدا لگتی کہو

کبر و نخوت

جس شخص نے کہ اپنی نخوت کے بل کو توڑا ۔ راہِ خدا میں اُس نے گویا جبل کو توڑا
باغباں تھا تجھے دو دن کی ہوا پر یہ غرور ۔ نہ رہے باغ میں گل ہو گئے خار آخرکار

وقت کی قدر

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز ۔ میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

اپنی ہستی

تیری سرعت کے مقابل اے عمر ۔ برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
اپنی ہستی حباب کی سی ہے ۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے
کہاں ہے دارِ فنا میں قرار کی صورت ۔ نمودِ عمر ہے برق و شرار کی صورت
ہزاروں حسرتیں جائیں گی میرے ساتھ دنیا سے ۔ شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

سعادتمندی

خاکساری، عاجزی، غربت، محبت، دوستی ۔ جن کے یہ افعال ہیں وہ ہی سعادتمند ہیں

انسانیت

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
کیا غضب ہے نہیں انسان کو انسان کی قدر ۔ ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے ۔ کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

استغنا

میری محتاجی دلیلِ فرطِ استغنا سمجھ ۔ کیا نہ ملتی مجھ کو گر مالک سے دولت مانگتا
دولتِ دنیا سے مستغنی طبیعت ہو گئی ۔ خاکساری نے اثر پیدا کیا اکسیر کا

کریم النفس

بالطبع گر کریم ہو تو مفلس بھی ہے کریم ۔ ہوتا ہے سایہ کا شجرِ بے ثمر سے فیض
نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر ۔ جہاں میں بند کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

مناجات

اے مرے چارہ ساز اے غفّار
اے مرے بندہ پرور اے ستّار

عبدِ مذنب ہوں میں تو ربّ غفور
کم ہیں تیرے کرم سے میرے قصور

جو کیا کارِ ناصواب کیا
نام توبہ کا بھی خراب کیا

میں نے توڑی ہے متصل توبہ
ہو گئی خود شکستہ دل توبہ

کون سے دن وفائے عہد کیا
عمر بھر ماسوا سے عہد کیا

سو کے کاٹی شبِ جوانی آہ
بل بے غفلت مری معاذ اللہ

اب مجھے چشمِ معرفت بیں دے
جلوہ دکھلا کے دل کو تسکیں دے

ارحم الراحمیں ہے نام ترا
پردہ پوشی ہے سب کی کام ترا

کب کسی پہ تمام رحمت ہے
سارے عالم پہ عام رحمت ہے

روسیہ ہو کہ روسفید کوئی
پر نہ ہو تجھ سے نا امید کوئی

گو ہے رحمت پہ تیری ناز بہت
ڈر یہ ہے تو ہے بے نیاز بہت

یاد تیری مجھے رہے ہر آن
بے ترے غیر کا نہ ہو کچھ دھیان